ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

نومبر ۱۹۸۷ء

اتنے سارے پھلوں کا
تازہ نکھرا روپ
احمد
مکسڈ فروٹ جام
TASTE AHMED PRESERVES IT
AHMED'S
JAM
MIXEDFRUIT

جلد نمبر ——— ۲
شمارہ نمبر ——— ۵
نومبر ——— ۱۹۸۷ء
ربیع الاوّل ——— ۱۴۰۸ھ
قیمت ——— پانچ روپے

زرِ سالانہ کے لئے خصوصی
بچت اسکیم کا صفحہ دیکھئے۔

ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی

سرپرست
ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

مشاورت
مشفق خواجہ ، امجد اسلام امجد

قانونی مشیر (اعزازی)
خواجہ عدیل احمد ایڈووکیٹ

مدیرِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

مدیرِ اعزازی
طاہر مسعود

ناظمِ اشتہارات
طارق ظفر ربّی

مدیرِ مسئول
تجمل حسین چشتی

مشیرِ ادارت
محمد سلیم مغل

خطاطی
رئیس الحسن ، عارف سعید

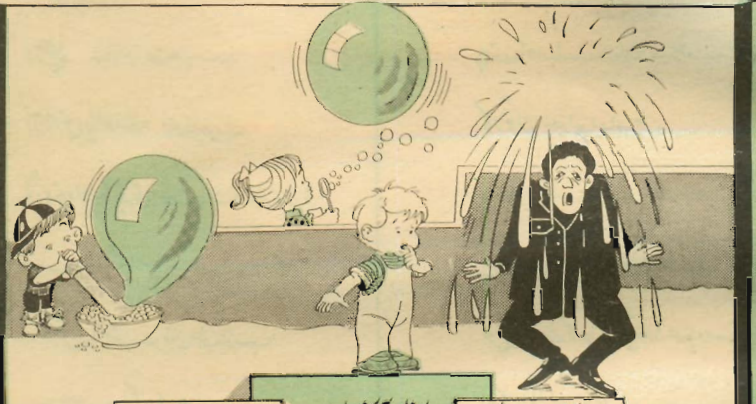

گرین گائیڈ اکیڈمی
ادارۂ اشاعت برائے
تعلیم و تعمیرِ سیرتِ اطفال
زیرِ سرپرستی
ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ ہیں پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی

ناشر : ظفر محمود شیخ ، طابع : زاہد علی ، مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس ، ایم اے جناح روڈ ، کراچی
برائے خط و کتابت و مقامِ اشاعت : گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲ ڈی نورس روڈ سائٹ کراچی

حسنِ ترتیب

اداریہ	۵
اچھی بات	۶
نعت — اقبال فاروقی	۷
ڈاک ڈاک کس کی ڈاک (خطوط کے جوابات)	۸
اس ماہ کا نام کیسے پڑا — حمیرا لطیف	۱۱
باباجی (خاکہ) بیگم ثاقبہ رحیم الدّین	۱۲
دریچہ (کالم) طاہر مسعود	۱۷
آزادی یا موت — ابوظفر زین	۲۱
ٹی وی اور ڈیڈی (نظم) شاہ نواز فاروقی	۲۷
سب سے اونچا سپاہی — صباحت تشکیل	۲۸
اسٹیشن ماسٹر — عرفان علی یوسف	۳۰
ہے نا حیرت کی بات	۳۷
کیسی پیاری بھول بھلیاں — حارث شمیم	۳۹
پرستان کی سیر — قرۃ العین حیدر	۴۱
میں تاریکیوں کو منور کروں گا (نظم) عارف انجم صدیقی	۴۴
کوڑے دان — کلیم چغتائی	۴۵
گلہری کی دُنیا — مشہود شہزاد	۵۴
مقابلہ (حق اسکواڈ) اخلاق احمد	۵۷
دائرہ معلومات — امِ ریاب جعفری	۶۷
کھیل کے آداب (آدابِ زندگی) غ۔الف۔صدیقی	۷۵
لذیذار لطیفے (منتخب لطائف)	۷۷
گھریلو باغبانی (مشاغل کی کہانی) عقیل عباس جعفری	۸۱
پناہ (سلسلہ وار ناول) عبدالعزیز عزمی	۸۹
کارٹون — خواجہ عاصر علی	۹۸
پاسبان (سلسلہ وار ناول) الف ملک سلیم	۹۹
چاکلیٹ کی کہانی — شین فاروقی	۱۰۷
نویں وکٹ کا عالمی ریکارڈ — محمد وسیم مغل	۱۱۰
انکل آئی کیو روبوٹ — سائنسی سوال وجواب	۱۱۱
نئی تحریریں (بچوں کا شعبہ)	۱۱۴
آؤ ملائیں ہاتھ (قلمی دوستی)	۱۱۹
امّی ابّو کا صفحہ	۱۲۲

اداریہ

پاکستان کا مقابلہ دنیا کی بہترین کرکٹ ٹیم ویسٹ انڈیز سے تھا۔

اس مقابلے میں ایک مرحلے پہ یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا جیسے پاکستان یہ میچ ہار جائے گا۔ کیونکہ ان کے کھلاڑی تیزی سے آؤٹ ہو رہے تھے۔ اور جو کھلاڑی پچ پہ تھے انہیں رن بنانے کا مشکل ہی سے موقع مل رہا تھا۔ ایسے نازک لمحے میں سلیم یوسف بلاّ سنبھال کے میدان میں اترے۔ چونکہ وہ بنیادی طور پر وکٹ کیپر ہیں اس لئے تماشائیوں کو ان سے بہت زیادہ توقعات نہیں تھیں۔ عام تاثّر تھا کہ وہ بھی دوسرے کھلاڑیوں کی طرح تھوڑے سے رن بنا کر پویلین کی طرف تھکے ہوئے قدموں سے لوٹ جائیں گے۔ لیکن سلیم یوسف نے نہایت اعتماد سے بیٹنگ شروع کی۔ وہ نہ ویسٹ انڈیز کے بولروں سے گھبرائے اور نہ ہی فیلڈروں کی شاندار فیلڈنگ سے مایوس ہوئے۔ کیونکہ انہیں احساس تھا کہ ان پر بھاری ذمّہ داری آن پڑی ہے اور انہیں ذمّہ داری اور جرأت مندانہ کھیل سے اپنی ٹیم کو یقینی شکست سے بچانا ہے۔ سلیم یوسف کے اعتماد، احساسِ ذمّہ داری اور جرأت مندانہ کھیل سے پاکستانی ٹیم کا اسکور تیزی سے بڑھنے لگا۔

تماشائیوں پر چھائی ہوئی مایوسی ختم ہونے لگی، اسٹیڈیم نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ سلیم یوسف اپنی شاندار بیٹنگ سے ٹیم کو مایوسی اور شکست سے نکال لائے۔ یہ انہی کی محنت اور لگن تھی جس کا فائدہ عبدالقادر نے اٹھایا اور آخری گیند پہ دو رن لے کر ویسٹ انڈیز جیسی مایہ ناز ٹیم کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ پاکستان جیت گیا۔ ہم جیت گئے۔ کیونکہ ہم جیتنے پہ آئیں تو ناممکن کو ممکن کر دکھاتے ہیں۔ تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ ٹیم کا ایک فرد بھی کتنا اہم ہوتا ہے۔ اس کی جدّوجہد ہو تو ٹیم جیت جاتی ہے اور وہ غیر ذمّہ داری کا مظاہرہ کرے تو ٹیم ہار بھی سکتی ہے۔

ہمارے درمیان کتنے ہی لوگ ہیں کہ جب برائیوں کے خاتمے کی بات ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کے کرنے یا کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان کھیلا جانے والا میچ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اس میچ پہ جتنا غور کریں گے انہیں اندازہ ہو گا کہ ایک اچھی ٹیم کی طرح ایک اچھی قوم کا ایک ایک فرد بہت اہم ہوتا ہے اس کی دیانت، شرافت احساسِ ذمّہ داری اور نیکی کا فائدہ ساری قوم کو پہنچتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سلیم یوسف کی محنت کا ثمر پوری ٹیم کو پوری قوم کو ملا۔

آپ کا دوست

طو محمود شیخ

اچھی بات

یک تالاب میں دو بطخیں اور ایک کچھوا رہا کرتے تھے اور اُن میں آپس میں بہت دوستی تھی ایک برس ایسا آیا کہ تالاب میں پانی بہت کم رہ گیا اور بطخوں کے لیے وہاں رہنا مشکل ہوگیا۔ ناچار دونوں نے ہجرت کی ٹھانی۔ جب کچھوے نے یہ سُنا تو رونے دھونے لگا کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں جاتی ہو، میں تمھارے بغیر کیسے جیوں گا۔" بطخ نے کہا "ہمیں خود تجھ سے جدائی کا بہت غم ہے، لیکن مجبوری ہے۔" کچھوے نے کہا "تم جانتی ہو کہ مجھ کو تم سے زیادہ پانی کی ضرورت ہے اور پانی پر ہی میری زندگی کا دارومدار ہے۔ تم جاتی ہو تو کسی نہ کسی طرح مجھے بھی ساتھ لے چلو۔" بطخوں نے کہا "ہمارا کب جی چاہتا ہے کہ تمھیں چھوڑ جائیں۔ مگر کیا کریں۔ دور دراز کا سفر ہے۔ نہ ہم تیرے ساتھ پیدل چل کر وہاں جاسکتی ہیں نہ تو ہمارے ساتھ اُڑ کر وہاں پہنچ سکتا ہے۔" لیکن جب کچھوے نے بہت اصرار کیا تو بطخوں نے کہا "اتنی مدت ہمارا تمھارا ساتھ رہا۔ ہم نے دیکھا تم ذرا پیٹ کے ہلکے واقع ہوئے ہو، کسی وعدے کو نباہنا تمھارے لیے مشکل ہے۔ اب بھی ہمیں ڈر ہے کہ جو ہم کہیں شاید تم اُس پر عمل نہ کرو۔" کچھوے نے کہا "بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم میرے بھلے کی بات کہو اور میں نہ مانوں۔" بطخوں نے کہا "اچھا ہم تمھیں ساتھ لے چلتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ جب ہم تم کو لیے ہوا میں اُڑ رہی ہوں تو تم منہ بالکل بند رکھنا لوگ ہمیں دیکھ کر طرح طرح کی باتیں بنائیں گے، بھبتیاں کہیں گے، شور مچائیں گے، تم ہرگز کوئی جواب نہ دینا اور اچھا بُرا کوئی لفظ منہ سے نہ نکالنا۔" کچھوے نے قسم کھائی کہ "بالکل خاموش رہوں گا۔" اس پر بطخیں ایک لکڑی لائیں۔ کچھوے نے لکڑی کو بیچ میں سے مضبوط دانتوں سے پکڑ لیا اور بطخیں دونوں سرے اپنی چونچوں میں تھام کر زمین سے اڑیں۔ جب ہوا میں اونچی ہوئیں تو ایک گاؤں پر سے گزر ہوا۔ لوگوں کی جب کچھوے اور بطخوں پر نظر پڑی تو بڑے حیران ہوئے اور یہ تماشا دیکھنے کے لیے سب چھوٹے بڑے گھروں سے نکل آئے۔ ایک شور مچ گیا "دوڑیو، دیکھیو، بطخیں کیسے کچھوے کو اُڑائے لیے جارہی ہیں۔ کچھوے کو لوگوں کی ان حرکتوں پر بہت غصّہ آیا۔ کچھ دیر تو چُپ رہا، لیکن آخر نہ رہا گیا۔ منہ کھولا کہ کچھ جواب دے، لیکن ابھی آواز نہ نکلی تھی کہ لکڑی دانتوں سے چھوٹ گئی اور سیدھا آسمان سے زمین کی طرف چلا۔ گرتے ہی ہڈی پسلی چور ہوگئی۔

اس مثل سے معلوم ہوا کہ جو نیک نصیحت نہیں مانتا اس کا دردناک انجام ہوتا ہے۔

انوار سہیلی

نعت

اقبال فاروقی

ہمارے نبیؐ رہ نما بن کے آئے
اندھیرے میں نورِ ضیاء بن کے آئے

ہمارے نبیؐ نے ہمیں روشنی دی
نئی رُوح پھونکی، نئی زندگی دی

سکھایا پرائے کو اپنا بنانا
بتایا گناہوں سے دامن بچانا

خدا کی محبّت سے سرشار ہیں وہؐ
خدا کے رسولوں کے سردار ہیں وہؐ

بھلائی کے رستوں پہ چل کر دکھایا
ہمارے نبیؐ نے عمل کر دکھایا

ہمیں دولتِ علم وہ دی نبیؐ نے
کہ ہیچ اُس کے آگے ہیں سارے خزینے

محمدؐ کی اُمّت میں شامل ہیں ہم سب
محمدؐ کی عظمت کے قائل ہیں ہم سب

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

عبداللہ ہارون ——— محمد علی سوسائٹی کراچی

"آنکھ مچولی" میں ایک نقل شدہ کہانی پڑھ کے آپ کو اپنے دوست کے سامنے شرمندگی ہوئی اور اب آپ کا خط پڑھ کے ہمیں آپ کے سامنے شرمندگی اُٹھانی پڑ رہی ہے۔ ہمارے ہی لیے نہیں کسی بھی رسالے کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ ہر تحریر کے بارے میں پتا چلا سکے کہ یہ چوری کی ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے ہمارے پاس بوتل کا جن ہوتا تو پھر کیا بات تھی۔ البتہ ہمارے ننھے لکھنے والوں کو سوچنا چاہیئے کہ چوری بالآخر پکڑی جاتی ہے جس کے بعد بدنامی اور رسوائی الگ ہوتی ہے۔ اور آئندہ چھپنے کا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے۔

محمد ارشد بٹ ——— گلبرگ لاہور

آپ ساتھیوں کی معلومات میں اضافے کے لیے ہم نے دائرہ معلومات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلے کو غور سے پڑھا کریں۔ کچھ عرصہ بعد یہ آپ کو آسان محسوس ہونے لگے گا۔

چوہدری ساجد حسین ——— رتن تالاب، کراچی

کئی مہینوں کے بعد آپ کے خط لکھنے کا شکریہ۔ آپ نے جن غلطیوں کی نشاندہی کی ہے وہ نوٹ کر لی گئی ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہیں گے۔

جے آئی ساغر ——— بلدیہ ٹاؤن، کراچی

آپ کی تحریریں قابلِ اشاعت ہوئیں تو انھیں ضرور جگہ ملے گی۔ ہم صرف ننھے ساتھیوں کی تصویریں شائع کرتے ہیں اس لیے ہماری معذرت قبول کیجیے۔

—— صفیہ سلطانہ صدّیقی، شاہ فیصل کالونی کراچی ——

آپ نے آنکھ مچولی کو آسمان کا چمکتا چاند قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اسے پڑھ کر علمی مرعوبیت چھانے لگتی ہے۔ یہ تو خیر اچھی بات ہے۔ ہاں اگر آنکھ مچولی پڑھتے ہوئے نیند آنے لگے، پھر ہمیں ضرور تشویش ہوگی۔ آپ کی نگارشات قابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں باری آنے پر شائع ہو جائیں گی۔

—— امجد علی شاہ، ظاہر پیر۔ حسن متہدی خراسانی، فیڈرل بی ایریا کراچی ——
—— پرنس وسیم بن اشرف، میاں چنوں، مُغیرہ صبحین، کراچی، ——
—— سعدیہ رفیق ورک، سیالکوٹ۔ محمّد اکرم سیالوی، ننکانہ صاحب ——

آپ سب کو ستمبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ اس کا شکریہ۔ آپ نے خاص طور پر حضرت عمرِ فاروق رضؓ، ہاتھ، ہیرو، اور حق اسکواڈ کی تعریف کی ہے جو لکھنے والوں تک پہنچا دی گئی ہے۔

—— مُنیر احمد فاضل، لاھور ——

جب آپ کو آنکھ مچولی کا تازہ شمارہ ملتا ہے تو آپ کو چاند جتنی خوشی ہوتی ہے۔ غالباً آپ یہ کہنا چاہتے تھے کہ رسالہ پاکر آپ کو ایسا لگتا ہے جیسے اندھیری رات میں چاند نکل آیا ہو۔ آپ یقین کیجیے ہم آپ سے خفا نہیں ہیں لیجیے اب تو اپنا غُصّہ تھوک دیجیے۔

—— محمّد محمود سیف اللہ، لانڈھی کراچی۔ سعید احمد، ٹنڈو آدم۔ محمّد شفیق ——
—— قصور۔ رخشندہ تابندہ ریاض، باغبانپورہ لاھور۔ ۔ ۔ ——
—— محمّد عنایت صدّیقی بھابھڑا ضلع سرگودھا اور فرح عزیز سکّھر، سندھ ——

آپ سب نے دائرہ معلومات کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ اس میں شریک ہوتے ہیں اور درست جواب بھیجتے ہیں لیکن آپ کا نام شامل نہیں ہوتا، اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کے جوابات دیر سے موصول ہوئے ہوں یا آپ نے کوپن کے بغیر جوابات بھیج دیے ہوں، آئندہ مقررہ تاریخ تک کوپن کے ساتھ جوابات روانہ کر دیجیے اگر جوابات درست ہوئے تو یقیناً آپ کا نام بھی آئے گا۔ یہ رسالہ تو ہے ہی آپ سب کا۔

—— عائشہ رحمٰن میمن، ڈرگ کالونی کراچی ——

آپ نے کراچی کے حالات کے باعث چھ ماہ بعد خط لکھا ہے، اس کا شکریہ! دعا کریں کہ کراچی سمیت پورے ملک میں امن و امان رہے اور ملک کا امن و سکون تہہ و بالا کرنے والے اپنے مقصد میں ناکام رہیں۔ آپ سندھی کہانیوں کا ترجمہ ضرور بھیجیے۔ اس کی اشاعت کے بارے میں تو پڑھنے کے بعد ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ قابلِ اشاعت

ہوئی تو باری آنے پر ضرور شائع کی جائے گی۔

——شکیل احمد جمرود خیبر ایجنسی۔ ملک عارف امیر عامر، راولپنڈی——

——رخسانہ زینت ملتان۔ محمّد طاہر رضا، میرپور خاص——

——ہما جمیل، نادیہ جمیل، مبینہ جمیل، کوہاٹ روڈ پشاور——

آپ آنکھ مچولی باقاعدگی سے پڑھتے ہیں اور اتنی ہی باقاعدگی سے خط بھی لکھتے ہیں۔ یہ آپ کی عنایت ہے۔ ستمبر کا شمارہ آپ کی توقع پر پورا اُترا۔ بہت شکریہ، ہماری کوشش ہے کہ اسے بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ جس کے لیے آپ کا تعاون درکار ہے۔ آپ نے مختلف کہانیاں، مضامین اور نظمیں وغیرہ بھیجی ہیں وہ زیرِ مطالعہ کی فائل میں ہیں اور قابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں باری آنے پر شائع ہو جائیں گی آپ اطمینان رکھیے۔

——پرنس آف اسلام۔ بورا روڈ میاں چنوں——

آپ کا جذبہ سلامت رہے مگر اسلام کے شہزادے صاحب آپ اپنے نام کے بارے میں اتنی راز داری کیوں برت رہے ہیں۔ اسلام تو جرأت اور ہمّت کا سبق دیتا ہے۔ آپ بھی آئندہ اپنے اصل نام سے ہی خط لکھیے تو زیادہ بہتر ہوگا رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ

——محمّد رفیع انصاری، لانڈھی، کراچی۔ محمّد اکرم سیال ننکانہ صاحب——

——صہیب احمد شیخوپورہ۔ شکیلہ شیرازی ٹنڈو آدم۔ راحت صلاح الدین، کراچی——

آپ سب نے بھی ستمبر کے شمارے کو سراہا ہے آپ نے اور کئی بچوں نے پرائڈ آف پوزیشن کے بارے میں معلوم کیا ہے ان سب سے عرض ہے کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ سرٹیفیکیٹ روانہ نہیں کیے جا سکے، بہر حال چند روز کے اندر یہ سرٹیفیکیٹ انشاء اللہ آپ کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ آنکھ مچولی کو پسند کرنے اور خط لکھنے کا بہت شکریہ!

——عامر اعجاز، ڈنگہ، ضلع گجرات——

آپ کو آنکھ مچولی بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت اچھی بات ہے، اسے خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھائیں آپ کو لگتا ہے کہ ہمیں آپ سے دشمنی ہو گئی ہے، بھلا آپ نے ہمارا کیا بگاڑا ہے جو ہم آپ سے دشمنی کریں گے۔ آپ کی بھیجی ہوئی چیزیں تو قابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں وقت آنے پر ہی شائع ہو سکیں گی۔ اب تو خوش ہیں نا آپ، اپنے والد صاحب کو ہمارا سلام کہیے۔

اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟

حمیرا لطیف

نومبر معنی کے لحاظ سے یہ نواں مہینہ ہے۔ مگر کیلنڈر میں اس کا شمار گیارھویں مہینے کے طور پر ہوتا ہے۔ موجودہ کیلنڈر کو یہ شکل اختیار کرتے کرتے صدیاں گزری ہیں۔ اس اثنا میں اس میں بیسیوں تبدیلیاں ہوئیں۔ کبھی مہینوں کی ترتیب بدلی گئی، کبھی ان کے نام بدلے گئے۔ اور کبھی ان کے دن گھٹائے اور بڑھائے گئے۔ مگر اہل روم کے بعد کسی کو سال کے آخری مہینوں کے نام بدلنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور رفتہ رفتہ یہی نام لوگوں میں رچ بس گئے۔ سیکسن لوگ اس مہینے کو "خونی مہینے" کا نام دیتے تھے۔ کیونکہ موسم سرما میں سخت سردی اور برف باری کے زمانے میں انھیں زندہ رہنے کے لیے اپنے بے شمار مویشیوں کو ذبح کرنا پڑتا تھا۔ اور ان کے گوشت پر ان کی گزر اوقات ہوتی تھی۔۔

بابا جی

بیگم ثاقبہ رحیم الدین

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب پاکستان کو قائم ہوئے تھوڑا عرصہ گزرا تھا۔ ہمارا گھرانہ ڈھاکہ سے کراچی آیا اور ایک ایسے پرانی وضع کے گھر میں رہنے لگا جس کا احاطہ بہت بڑا تھا۔ گھر کے لان کی دیکھ بھال کے لیے رحمت علی مالی تھا جس کا خاندان ہمارے آنے سے پہلے دو کوارٹروں میں بسا ہوا تھا۔

یوں تو ہم سب بچوں کی رحمت علی سے دوستی تھی مگر ہمیں اُس کا باپ جیسے سب "بابا جی" کہتے تھے بہت اچھا لگتا تھا۔ رحمت علی سے اکثر یہ فرمائش ہوا کرتی تھی کہ اونچی ٹہنی سے امرود توڑ دو۔ جھولا ذرا کس کر باندھ دو کہ ٹیڑھا نہ ہو۔ پتنگ کی ڈور خرید کر لا دو وغیرہ ۔۔۔ مگر وہ ان کاموں کے علاوہ کبھی بات چیت نہ کرتا تھا۔۔ البتہ "بابا جی" ایسی سادہ اور پیاری ہستی تھے جن کو بچے ہر وقت گھیرے رہتے تھے۔

یوں دیکھنے میں "بابا جی" کی شکل و صورت میں کوئی اچھائی نہ تھی۔ وہ دُبلے پتلے سیاہ رنگت کے بہاری تھے۔ وہ کسی زمانے میں گورنمنٹ اسکول کے ہوسٹل کے چوکیدار رہے تھے جس کی وجہ سے پنشن ملتی تھی اور ہر سال اُن کی چھوٹی سی زمین سے بیر بکا کرتے تھے۔ یعنی رحمت علی کی تنخواہ کے علاوہ یہ دونوں رقمیں بھی مقررہ وقت پر آجایا کرتی تھیں۔ وہ سال میں سات آٹھ مہینے تہبند اور بنیان میں گزارہ کرتے تھے البتہ سردی کے موسم میں ایک سفید موٹے کرتے کا اضافہ کر لیا کرتے تھے۔ وہ ہمارے گھرانے کے نوکر نہیں تھے۔ وہ عید تہوار یا کوئی خاص موقع پر ہمارے گھر آتے تو کلف دار صافہ باندھ لیا کرتے تھے۔

"باباجی" میں جانے کیا بات تھی کہ گھر اور آس پاس کے علاقے کے لڑکے بالے اُن کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ وہ کم باتیں کیا کرتے تھے۔ جب دیکھو ان کی آنکھوں میں مسکراہٹ اور چمک نظر آتی تھی۔ میں نے کئی بار ان کے منہ سے یہ کہتے سُنا "رحمت بیٹے دل صاف رکھو... ہمیشہ صاف رکھو۔" اور اُن کو کئی بار بُوا جی کو یہ سمجھاتے سُنا... "بی بی اپنا جی میلا نہ کرو۔" میں اکثر باباجی کا مذاق اُڑاتی تھی کہ "باباجی! کیا آپ کو دھوبی کا کام بہت پسند ہے؟" وہ جواب میں صرف ہنس دیا کرتے تھے۔ میری ایک دوست بڑی شریر اور پھرتیلی تھی۔ وہ باباجی کے صافے کی نوک پر تیزی سے چیونگم چپکا دیتی اور ان کی ہنسی اُڑاتی "ہاں تو بابا یہ دل کوئی فیکٹری ہے۔ سڑک ہے، آخر کیا ہے جو آپ ہر وقت میل مٹی اور کوڑا صاف کرواتے رہتے ہیں"۔

ایک دن باباجی نماز پڑھ کر آئے، کھانا کھا کر، جامن کے درخت کے نیچے دری بچھا کر سو رہے۔ طارق اور جمّی وہاں سے گزرے تو اُن کی ٹوپی اُتار لی اور چپکے سے چپّل اُلٹ پُلٹ کر دی۔ سیدھے پیر کی اُلٹی طرف اور اُلٹے پیر کی سیدھی طرف۔ بیچارے سو کر اُٹھے تو گھنٹوں ٹوپی ڈھونڈتے رہے اور اُلٹ پلٹ چپّل پہنے سارا دن اپنا کام کرتے رہے۔ دوسرے دن معلوم ہونے پر بھی صرف "بُری بات ہے" کہہ کر چُپ ہو رہے۔

باباجی خاصے بوڑھے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ وہ کئی باتیں بھُول جاتے ہیں وہ صرف اتوار کے دن کا اخبار خریدتے تھے اور بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ بقول رحمت علی اشتہار بھی ہجے کر کے پڑھا کرتے تھے۔ جب وہ اخبار میں گُم ہوتے تو میں اور میری دوست مل کر باباجی سے کئی اہم وعدے کروا لیتے۔ مثلاً ہمیں شام میں صنعتی نمائش میں "موت کا کنواں" دکھانے اور چوڑیوں کے اسٹال پر لے چلیں، کوکو، بند روڈ پر "چینی بڑھیا کے لال لال بال" خرید کر کھانا چاہتی تھی۔ آپا اچار اور پاپڑ منگوانا چاہتی تھیں۔ غرض کہ ہم بچّوں کی فرمائشیں جاری رہتیں اور باباجی جانے کس دھیان میں "ہوں، یا، ہاں، ہاں" کہہ دیتے۔ ممتاز دوڑ کر کاغذ لا کر ہر ایک کی فرمائش کو کاغذ پر نوٹ کر لیتی۔ اس وقت صرف ہمارے بڑے بھائی نُوری کے پاس گھڑی تھی۔ وہ وقت درج کر دیتے کہ باباجی نے فلاں دن اور فلاں وقت یہ وعدے کر لیے ہیں۔ دوسرے دن باباجی لاکھ خدا کو گواہ بناتے کہ انھوں نے قطعی نہیں سُنا تھا اور نہ وعدہ کیا تھا۔ ہم سب اُن سے روٹھ جاتے، اور لان کے کونے میں دُور جا کر چُپ چاپ بیٹھ جاتے تھے اور پھر باباجی مجبوراً ہمیں نمائش دکھانے لے جاتے اور وہ سارے وعدے پورے کرتے جو انھوں نے ہم سے نہیں کیے تھے۔

یہ تو اکثر سُنا ہے کہ رحم دِل لوگ مانگنے والوں کو مایوس نہیں کرتے اور یہ بھی ہوتا ہے بہت التجا کرنے پر ناخوشی سے ہی سہی مگر غریب کی مدد کر دی جاتی ہے۔ لیکن جو کسی کا دُکھ جان لے اور اُس کے کہے بغیر رات کے اندھیرے میں چپکے سے مدد کر دے تو وہ کیسا اعلیٰ انسان ہوگا!

ایک بار اسکول کے ٹیچر محمّد حسن نے اپنی بیوی نسیمہ کے علاج کی خاطر کچھ رقم قرض لے لی۔ محمّد حسین دن رات فکر مند رہتا کہ قرض کیسے اتاروں گا، کیونکہ سُود بھی بڑھ رہا تھا۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا، باباجی سحری کے وقت محمّد حسین کے گھر گئے اور کچھ رقم دے آئے۔ محمّد حسین اس ہمدردی سے حیران رہ گیا اس نے باباجی کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی رقم لوٹا دے گا۔ دن گزرتے گئے، لیکن محمّد حسین نے رقم واپس نہیں کی اور جب تقاضا کیا جاتا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگتا۔ باباجی نے جب یہ صورتحال دیکھی تو وہ بھی خاموش ہو گئے اور اس واقعے کو اس طرح بُھلا دیا جیسے کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک دوست نے باباجی کی چند دینی کتابیں بذریعہ رجسٹری بھجوانے کا ذمّہ لیا اور بعد میں رسیدیں پیش کردیں۔ رحمت علی نے ڈاک خانے سے رسیدیں چیک کروائیں تو معلوم ہوا کہ جھوٹی اور جعلی ہیں۔ یہ دھوکہ کھانے کے بعد بھی باباجی نے اپنے دوست کے لیے دُعا کی کہ مولا اُسے نیک بنائے۔ باباجی کی زندگی اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی تھی۔ وہ معاف کردینا جانتے تھے اور دوسروں کی غلطیوں کو صرف وہی معاف کرتا ہے جس کا دل وسیع ہو۔

ایک دفعہ کیا ہوا کہ باباجی کے انعامی بونڈ نکل آئے تو انھوں نے خوش ہو کر اعلان کیا کہ وہ اس رقم سے اپنی بھانجی کی شادی پر بڑا سا تحفہ دیں گے۔ دو لڑکوں نے اس پر باباجی کا مزاحیہ خاکہ بنایا جس کے آخر میں انھوں نے نعرہ لگایا۔

"باباباباحاتم طائی۔۔۔ نہیں نہیں بابا کنجوس مکھی چُوس۔۔۔" اس دن واقعی بابا کا دِل دُکھ گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہفتہ بھر بعد دونوں لڑکوں کے والدین کو اس واقعے کی خبر ہوئی۔ خوب ہی ڈانٹ پڑی۔۔۔ دونوں کو کہا گیا کہ معافی مانگیں۔ باباجی نے انھیں سچے دِل سے معاف کردیا۔ نہ صرف معاف کردیا بلکہ دونوں کو کھجوروں کا تحفہ بھی دیا۔ اسی طرح میری دوست مینہ ہمیشہ اُن کی نقل کر کے سب کو ہنساتی تھی۔ وہ ہر روز باباجی کے کھانے اور تنکے سے دانت کُریدنے کی نقل کرتی اور ہم سب تالیاں بجاتے تھے۔ تین چار مہینے بعد مینہ گھر سے ہوسٹل جارہی تھی۔ چلنے سے پہلے وہ ملنے آئی تو باباجی نے اُسے پیار کیا۔ اور اُسے ایک کاپی ایک پنسل اور سُرخ رنگ کے دو ربن بھی دیے۔

جب باباجی نیم کے درخت تلے چارپائی بچھا کر سوتے، ہم چارپائی کے نیچے لیٹ کر زور زور سے ٹرانزسٹر بجاتے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اُٹھتے اور کہتے جاتے "یہ ہوٹل والا بڑا بدتمیز ہے، ہر وقت فلمی گانے سُنتا رہتا ہے۔" وہ سلیپر گھسیٹتے ہوئے چلے جاتے، تب ہم نیچے سے نکل کر دوڑ لیتے۔

دو چار سال بعد، ایک واقعہ یہ ہوا کہ باباکی زمین جہاں بیر ہوا کرتے تھے، دیمک سے بھر گئی۔ بابا کو نقصان بھی ہوا اور افسوس بھی۔۔۔ وہ اب بوڑھے ہو گئے تھے اور ان کی صحت گرتی جارہی تھی۔ جنوری کے مہینے میں ان کے دوست رمضان خان کے نواسے کا عقیقہ تھا۔ بابا ملیر سٹی گئے۔ لیاری ندی پار ایک بستی تھی جہاں رمضان خان کا گھر تھا۔ یوں، تو یہ ندی اکثر خشک رہتی ہے، مگر اس سال ندی میں پانی آگیا تھا۔ بابا پاؤں گھسیٹتے، لکڑی ٹیکتے ہوئے اور لڈّوؤں کا ٹبّہ

ہاتھ میں لیے چلتے رہے، نہ جانے ٹھنڈ لگی یا وہ زیادہ تھک گئے تھے کہ رمضان خان کے گھر سے آتے ہی بخار چڑھا۔ پہلے کھانسی ہوئی اور پھر نمونیہ ہوگیا۔ ان کے علاج اور تیمار داری میں کسر نہ چھوڑی گئی مگر بابا کو اچھا نہ ہونا تھا نہ ہوئے وہ لیٹے لیٹے بھی مُسکراتے رہتے۔ مجھے بھاگ دوڑ میں ہونٹ میں کیکر کا کانٹا چُبھ گیا تھا۔ میرے سُوجے ہوئے ہونٹ کو دیکھ کر ساری سہیلیاں ہنسا کرتی تھیں۔ بابا نے مجھے بلایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دُعا دی کہ "اب کانٹا تو نکل گیا ہے تکلیف بھی نہ رہے گی"۔ تھوڑے دنوں میں باباجی لاغر ہو گئے اور ان کو رحمت علی چمچے سے چائے پلاتا تھا۔ ہم بچّوں کا آنا جانا بند کر دیا گیا۔

ہم نے ایک دن دیکھا مغرب کا وقت ہے اور بابا کے کوارٹر کی بتّی جل رہی ہے۔ ہمارے گھر دعوت تھی۔ رحمت علی بیرے کی مدد کر رہا تھا۔ مجھے کھڑکی سے باباجی نظر آئے، میں ننگے پاؤں چلتی ہوئی گئی اور کھڑکی اوٹ سے دیکھنے لگی۔ باباجی کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں سُرخ تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ لکھتے جا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ بڑبڑا بھی رہے تھے "میں نے فیروزالدّین کا۔۔۔ پورا واقعہ لکھا ہے۔۔۔ نو سال سے اس نے میرا خون پی۔۔۔ لیا ہے۔۔۔ احمد جان نے تین چار بار برادری کے سامنے۔۔۔ ہاں ہاں بے عزّتی کی ہے۔۔۔ اور' اور۔۔۔ میرا روپیہ بطور قرض رشیدہ اور رمضان خان پر ہے۔۔۔ اللہ اللہ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ رحمت علی کی بیوی نے میلے میں مجھ پر بُرے الزام دھرے۔ ناظم آباد سے گامُو دو دن کے لیے آیا تھا۔ اور جاتے جاتے میری گائے چُرالی۔۔۔ اور ہاں یہ۔۔۔ بھی۔" اِن بکھرے ہوئے جملوں کے ساتھ ہی وہ چکرا گئے اور دم سادھ کر بستر میں لیٹ گئے۔ میں گھبرائی اور روتی ہوئی گھر آئی اور اپنی امّی سے کہہ کر ڈاکٹر بھجوایا۔

صبح صبح جب ہم بہن بھائی اسکول جانے والے تھے تو میرا دھیان باباجی کی طرف گیا۔ دبے پاؤں میں دروازے تک گئی۔ ایک دروازہ کھُلا تھا۔ رحمت علی شاید بابا کے ساتھ رات بھر جاگا تھا' لہٰذا اب گہری نیند سو رہا تھا۔ بابا پلنگ پر بیٹھے تھے اور اپنے کل کے ادھُورے لکھے ہوئے صفحات کو پھر سے پڑھ رہے تھے۔ ان کے کمزور چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکی سے سورج کی ہلکی سی کرن بابا کی پیشانی پر آکر چمکنے لگی اچانک انھوں نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ بہت دھیمے سے، اپنے آپ سے کہنے لگے "مولا ہمیں کسی سے کیا۔۔۔ تم مالک ہو۔ تمھارا کام تم جانو۔۔۔ ہم کیوں تمھیں میل کچیل دکھائیں۔۔۔! اور ہاں ہم کیوں تمھیں کوڑا کرکٹ بھیجیں۔۔۔! تمھارا کام تم جانو۔۔۔" اس کے بعد بابا چُپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ اپنی سانس سنبھال کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ اپنے تمام صفحات پھاڑنے لگے۔ اتنے میں اُن کے چہرے پر پسینہ آگیا۔ خود سے بولے "چلو بھئی مولا تمھیں غصّے میں جانے کیا کیا لکھ دیا تھا۔۔۔ پتہ نہیں میں ساتھ لے جاتا یا شاید یہیں چھوڑ جاتا۔۔۔ توبہ ہے توبہ! دیکھ لے بھائی یہ کاپی پھر صاف ہے۔ لو بالکل صاف۔۔۔"

بابا کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر مجھے اب کچھ سُنائی نہ دیتا تھا۔ جیسے ہی وہ پلنگ پر گرے، میں زور زور سے رونے لگی۔ رحمت علی جاگ اُٹھا اور ہمارے دوست اور گھر والے بابا کے گھر میں آ گئے۔ مگر ہمارے لاکھ آوازیں دینے پر بھی بابا جی نہ مُسکرائے نہ بولے۔۔۔

پھر میں اسکول چلی گئی۔ جب واپس آئی تو بابا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دُور لے جایا جا چکا تھا۔ سامنے ہری گھاس پر ہمارے پڑوس کی تین سالہ بچی بینا کھیل رہی تھی اور اس کی بڑی بہن جھولا جھول رہی تھی۔ میں بجائے گھر جانے کے بینا کے ساتھ پیڑ کے تنے سے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ بینا کے ہاتھ میں سفید کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے اور وہ اُن سے گھاس پر سڑک بنا رہی تھی اور اس پر چھوٹی ڈنکی کار چلاتی جاتی تھی۔ دو منٹ بعد بینا کی بہن، بینا کو لے کر گھر چلی گئی مگر سفید ننھی سی سڑک وہیں رہ گئی۔ ارے رے رے۔ یہ کیا؟ یہ کاغذ کے سفید ٹکڑے تو وہی تھے جو بابا نے پھاڑ کر پھینکے تھے۔

آج اس بات کو زمانہ گزر گیا۔ جب بھی بابا جی کا کوئی ذکر کرنے لگتا ہے تو میری نظروں میں ایک اُجلی اور صاف ستھری پگ ڈنڈی اُبھرتی ہے۔ اللہ جانے بابا جی میں اور اس چھوٹی سی پگ ڈنڈی میں کیوں اتنا میل ہے؟ شاید اس لیے کہ بینا نے ہری گھاس پر کھیلتے ہوئے، سفید کاغذ کے ٹکڑوں سے راستہ بنایا تھا۔۔۔؟ میں اب تو بابا جی کو بھول بھی گئی ہوں، مگر پھر بھی مجھے کہیں کہیں آنکھیں موندتے ہی ایک پیاری سی۔۔۔ سفید پگ ڈنڈی دکھائی دے جاتی ہے۔

سیرتِ طیبہ پر انعامی مقابلۂ مضمون نگاری

ربیع الاوّل کے مبارک مہینے کے حوالے سے ادارہ "آنکھ مچولی" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر انعامی مقابلۂ مضمون نگاری منعقد کرا رہا ہے۔ بہترین مضمون پر دو سو روپے کی کتب دی جائیں گی۔ مضامین وصول کرنے کی آخری تاریخ ۲۰ نومبر ہے۔ درج ذیل موضوعات میں سے کسی ایک پر آپ مضمون ارسال کر سکتے ہیں۔

۱ حضورؐ کا بچپن

۲ حضورؐ اور بچے

۳ حضورؐ اور بچوں کی تعلیم و تربیت

۴ حضورؐ کے پسندیدہ کھیل

۵ سیرتِ طیبہ کا ایک پہلو جس نے مجھے متاثر کیا

دریچہ

طاہر مسعود

میری گاڑی جوں ہی سگنل پر رُکتی ایک لڑکا ہاتھوں میں پھُولوں کے ہار لیے پہنچ جاتا اور کھڑکی سے جُھک کر کہتا "بابوجی، ہار لوگے ؟" میں اُس سے کبھی کبھار چند ہار خرید لیا کرتا تھا۔

ہار خریدتے وقت اکثر گداگر بھی اپنے ہاتھ پھیلا دیتے تھے "بابوجی اللہ کے نام پہ"۔ لیکن عام طور پر میں بھیک دینا پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ میرے خیال میں بھیک مانگنا اور بھیک دینا دونوں ہی انسانیت کی توہین ہے۔ میری نظروں میں عزّت کے مستحق وہی لوگ ہیں جو اپنی محنت اور صلاحیت کے بَل بُوتے پر زندہ رہنا جانتے ہیں۔ وہ ہار بیچنے والا لڑکا مجھے اسی لیے اچھا لگتا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ماں پھولوں کے یہ ہار تیّار کرتی ہے اور وہ اُسے بیچتا ہے۔ اس طرح دونوں ماں بیٹے زندگی کے شب و روز بُرے بھلے طریقے سے گزارتے ہیں۔

ایک روز اسی سگنل پہ وہ لڑکا پریشان پریشان سا نظر آیا۔ خلافِ معمول اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ اس کے سارے ہار کسی نے چُرا لیے تھے۔ کیونکہ ہار اور اس قسم کی چیزیں چرائی جا سکتی ہیں۔ اور جو چیز کسی صورت میں چُرائی نہیں جا سکتی وہ انسان کا حوصلہ، اُس کا عزم اور اس کی خود داری ہے۔ اور یہ ساری خصوصیات تو اس لڑکے میں پہلے ہی سے موجود تھیں، لیکن سوال یہ ہے کہ میں یہ ساری باتیں کیوں کر رہا ہوں۔ اگر آپ میری اس تحریر کو توجّہ سے پڑھیں گے تو آپ کے لیے یہ سمجھنا یقیناً مشکل نہ ہوگا کہ اس دنیا میں یُوں تو ہر طرح کے لوگ رہتے ہیں لیکن ہر جگہ آپ کو تین قسم کے لوگ ضرور ملیں گے۔ ایک وہ جو دوسروں کی محنت میں سے اپنا حصّہ مفت طلب کرتے ہیں دوسرے وہ جو ناجائز طریقے سے دوسروں کا حق مارتے ہیں۔ تیسرے وہ جو خود اپنی محنت سے اپنی دُنیا بناتے ہیں۔ انسانوں کی یہ تیسری قسم ہی عزّت و تکریم کے لائق ہوتی ہے۔ اس وقت جہاں کہیں بھی ایسے لڑکے جو اپنے قوّتِ بازو سے اپنی دُنیا آپ پیدا کر رہے ہیں ہماری تعظیم کے مستحق ہیں خواہ یہ لڑکے پھولوں کے ہار بیچتے ہوں، کسی ورکشاپ پر گاڑیوں کی مرمّت کرتے ہوں، کسی کارخانے میں جُتے رہتے ہوں، کسی اسٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی میں کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں، یا کہیں کوئی ننھا سا پودا لگا رہے ہوں۔

اِک نیا کمال
اِک نیا معیار
نئے دَور کی نئی پینسل
Goldfish
DELUXE PENCIL
شاہ سنز لمیٹڈ
ڈی ۸۸ - ایس - آئی - ٹی - ای - کراچی
فون: ۲۹۳۴۵۱، ۲۹۳۴۵۲

Midas Khi

آزادی یا موت

ترجمہ : ابوظفر زین

یہ زمانہ تھا ۱۸۱۰ء کا جب کہ نپولین بونا پارٹ نے تمام فرانس پر اپنی آمریت قائم کر لی تھی اور انگلینڈ سمیت یورپ کے اکثر ممالک اس کے خوف سے لرز رہے تھے۔ فرانس والوں نے انگلینڈ کا ایک زبردست مایۂ ناز جاسوس لمارا پوائنٹی پکڑ لیا تھا۔ جو اس وقت شہر لائنس کے عظیم قید خانے میں جکڑ بند تھا۔ انگلینڈ اور فرانس میں کوئی گرم جنگ نہ تھی لیکن دونوں ایک دوسرے کے دشمن ضرور تھے اور ایک دوسرے کے دشمنوں کو مدد پہنچا رہے تھے۔

حکومتِ برطانیہ لمارا پوائنٹی کو فرانس کی قید سے چھڑا لینے کے لیے بہت بے چین تھی۔ کوئی دوسرا جاسوس اس کی صلاحیتوں کا ملنا بہت مشکل تھا۔ وہاں اس پر جاسوسی کا مقدمہ چلنا تھا اور یقیناً موت کی سزا ہونی تھی، اگر اُسے چھڑانا ہی ہے تو دیر کی گنجائش نہ تھی۔ وقت قیمتی وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔

حکومتِ برطانیہ نے اُسے چھڑانے کا کام ایڈمرل جان پرائر کے سپرد کر رکھا تھا۔ جس کی زیر دست مہارت جاسوسی کے کام میں بار بار ثابت ہو چکی تھی لیکن ابھی وہ پوائنٹی سے جو نیر ہی تھا۔ اس وقت وہ بحری جنگی جہاز "انٹر پرائز" کا سب سے بڑا افسر یعنی ایڈمرل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انٹر پرائز جنگی جہاز سے زیادہ جاسوسی کا جہاز تھا اور اس پر جتنے ملازمین تھے وہ سب مانے ہوئے تجربہ کار جاسوس تھے۔

اس وقت ایڈمرل جان پرائر کے کیبن کے خفیہ تہہ خانے میں ایک اہم کانفرنس ہو رہی تھی۔ ایڈمرل نے کپتان ہارڈنگ۔ سیکنڈ افسر ٹامی اور چیف انجینئر گن شاٹ کو مشورے کے لیے بلایا تھا۔ بات زیرِ غور یہ تھی کس طرح لمارا پوائنٹی

کو فرانس کی قید سے چھڑا لیا جائے اور وہ بھی جلد از جلد۔ چونکہ جہاز ان دنوں لنگر انداز تھا اس لیے سب کو فرصت تھی۔ چار ہوشیار تجربہ کار دماغ اپنی اپنی طاقت لگا رہے تھے اس گتھی کو سلجھانے میں یکے بعد دیگرے کئی نسخے پیش کیے گئے۔ لیکن ایڈمرل پراٹر کی دُور اندیشی نے سب کو مسترد کر دیا۔

بالآخر ایک رائے کچھ اچھی نظر آئی۔

چیف انجینئر گن شاٹ نے کہا "ایڈمرل! وہ جو اپنے پاس ایک سابق کپتان ڈان کامٹن گرفتار ہے۔ وہی جس پر غبن اور جنگی اسلحہ جات بیچ دینے کا الزام ہے، جس کا مقدمہ عنقریب آپ کے پاس پیش ہونے والا ہے، اسے اگر بڑا لالچ دیا جائے... چونکہ وہ بڑا لالچی ہے... تو موت سے بھی کھیل جائے گا۔ وہ فرانسیسی زبان بھی بہت اچھی بول سکتا ہے۔ کیوں نہ ہم لوگ اُسے اس کام میں استعمال کریں"۔؟

ایڈمرل جان پراٹر اپنے کیبن میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ سامنے والی کُرسی پر بیٹھا تھا سابق کپتان ڈان کامٹن۔ اگرچہ اس کے ہاتھ آزاد تھے اور وہ سگریٹ پھونک رہا تھا لیکن اس کے پاؤں بندھے تھے۔ جہاز پر سے اور وہ بھی کیبن سے بھاگ جانے کا کوئی خطرہ نہ تھا پھر بھی دروازے پر سیکورٹی گارڈ کی ڈیوٹی لگی تھی۔ ایڈمرل نے کہا۔

"کامٹن! تم ہمارے بہت اچھے کپتان تھے۔ آج بھی برطانوی بحریہ کو بہت افسوس ہے تمھیں کھو دینے کا تم سے وہ جرائم سرزد ہو گئے جو ایک کپتان سے ہرگز نہیں ہونے چاہئیں۔ دیکھو تمھارا مقدمہ میرے سامنے آنا ہے۔ ہم لوگ تحقیقات کر رہے ہیں۔ تمھارے جرائم ثابت ہونے میں زیادہ کسر باقی نہیں ہے۔ مجھے اختیار ہوگا تمھیں کڑی سے کڑی سزائیں دینے کا بلکہ کورٹ مارشل کر دینے کا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"یس سر!"

"مجھے بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں چاہتا ہوں زندگی۔ آزادی۔ عزت۔ اپنی جائیداد اور بنگلہ کی واپسی۔ بیوی بچوں کی صحبت۔ میں اب نوکری پر واپس آنا نہیں چاہتا۔"

"کامٹن! ہر برطانوی شہری کو یہ نعمتیں ملنی چاہئیں۔ میں نے تمھاری آزادی، عزت اور دولت کے حق میں حکومت سے باتیں کر لی ہیں۔ حکومت یہ سب کچھ تمھیں واپس کرنے کو تیار ہے۔ اوپر سے ایک اچھی خاصی زمینداری بھی۔ مگر مائی ڈیئر! تمھیں ایک قیمت ادا کرنی ہے۔"

"وہ کیا؟"

ایڈمرل نے کہا "تمھیں فرانس کی قید سے ہمارے نامور جاسوس لمارا پوائنٹ کو چھڑا کر انگلینڈ پہنچا دینا ہے۔ کیسے؟

یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ حکومت ہر طرح تعاون کو تیار ہے۔ کامیابی کی صورت میں یہ ۔ ۔ ۔ انعامات تمہارے ہیں۔ ناکامی کی صورت میں جیسا کہ تم جانتے ہو، حکومتِ فرانس تمہیں گولی مار دے گی۔ سوچ لو۔ کل جواب دینا۔ اگر تمہارا جواب ہاں ہے تو ہم تم اور حکومت کے چند افسران مل کر اسکیم تیار کر لیں گے اگرچہ یہ کام بڑی ہمت، بڑے خطرے اور جاں فشانی کا ہے۔ ہم نے تمہارا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ تم فرانس کے ملک، اس کی فوج اور سب سے بڑھ کر اس کی زبان سے واقف ہو۔ اگر کوئی یہ کام کر سکتا ہے تو وہ تم ہو۔ سوچ لو۔ کل جواب دینا۔ اگر تمہارا جواب نہیں میں ہے تو یہ راستہ کورٹ مارشل کی طرف جاتا ہے۔"

"میں رات بھر خوب غور کر لوں۔ ویسے اُمید ہے میرا جواب ہاں میں ہوگا۔ آپ یہ زنجیریں تو ذرا ڈھیلی کرا دیں تاکہ میں ایک رات آرام سے سو سکوں۔"

"مگر دروازے پر ہمارا گارڈ تعینات رہے گا۔"

کامٹن نے اثبات میں جواب دے دیا تھا۔

پھر وہی کیبن ایڈمرل جان پرائر کا۔ ڈان کامٹن۔ چند دیگر افسران۔

ایڈمرل نے کہا" ہماری خوش قسمتی سے لمارا پوائنٹی نارمنڈی جیل میں پہنچا دیا گیا ہے، جہاں اُس کا مقدمہ شروع ہونے والا ہے۔ نارمنڈی برطانوی ساحل سے صرف بیس میل دُور ہے۔ ایک اچھا تیراک اُسے بخوبی عبور کر سکتا ہے اور ہم جانتے ہیں لمارا پوائنٹی بہت اچھا تیراک ہے۔"

ڈان کامٹن نے کہا" میں بھی بہت اچھا تیراک ہوں۔"

ایڈمرل بولا" میں قسمت کا شکر گزار ہوں کہ اُس نے اتنی اچھی خوش قسمتی ہماری راہ میں ڈال دی ہے۔ اگر تم لوگ فرانس کے ساحل سے دس میل بھی اس طرف آ گئے تو برطانیہ کی آبدوز کشتیاں تمہیں اٹھا لیں گی۔ مگر یاد رہے، فرانس کی آبدوز کشتیاں اپنی تمام سرچ لائٹ کے ساتھ تمہیں مچھلی کی طرح لوہے کے جال میں پکڑ لینے کی پوری کوشش کریں گی۔ آؤ ہم لوگ سر جوڑ کر بیٹھیں کہ کس طرح تمہیں فرانس کے ساحل پر پہنچا دیا جائے۔ آگے تم جانو خدا جانے مگر تمہاری زندگی تک ہم لوگ تم سے غافل نہیں رہیں گے۔"

اسکیم بن کر تیار ہو گئی۔ کامٹن کو فرانسیسی بحریہ کی سبز وردی کمانڈنگ افسر کی پہنا دی گئی تاکہ وہ فرانسیسی بحری افسر معلوم ہو۔ اور وہ بھی بہت اونچے رینک کا۔ اسکیم کے تحت ایک فرانسیسی بحری جنگی جہاز کو گولہ مار کر ڈبو دینا ضروری تھا۔ تاکہ معلوم ہو کامٹن اس جنگی جہاز میں تھا اور غرقابی سے بچ کر ساحل فرانس پہنچ گیا ہے۔

ایڈمرل جان پرائر کے زیر دست جنگی جہاز" کارڈف" نے لنگر کھول دیا اور کھلے بحر اوقیانوس میں داخل ہو

گیا کسی تسکار کی تلاش میں۔ حُسنِ اتفاق ایک چھوٹا فرانسیسی جنگی جہاز دُور نظر آیا اس پر توپ کے دھانے کھول دیئے گئے اور اُسے ڈُوبنا ہی پڑا۔ فوراً ہی کامٹن کو سمندر میں اتار دیا گیا کہ ڈوبتے ہوئے جہاز کا کوئی تختہ پکڑ کر ساحلِ مراد کو پہنچ جائے۔

بارہ میل تک سمندر کی پُرزور لہروں اور تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اور وہ بھی صرف ایک چھوٹا سا تختہ پکڑ کر ڈان کامٹن کی انگلیوں نے خشکی کو تھاما۔ وہ ساحل پر چڑھا اور جیسا کہ اُسے امید تھی ساحلی محافظین کے بندوق برداروں کا ایک دستہ فوراً سامنے آیا۔ سبز یونیفارم میں ایک افسرِ اعلیٰ نے فوراً اپنی بندوق چھتیائی "انڈس تُو آئی؟ (تم کون ہو)"

کامٹن نے فوجی انداز میں اپنا ایک ہاتھ بلند کیا اور فوجی فرانسیسی میں بولا "اسے الگ کرو افسر۔ کیا تم اپنی بحریہ کے دوسرے افسر کو پہچانتے نہیں ہو"؟

"تم کون ہو؟ میں تمھیں نہیں جانتا۔ اپنے کاغذات دکھاؤ"۔

کامٹن سیدھا کھڑا ہو گیا آنکھ میں آنکھ ڈال کر بولا "ہم لوگ تباہ ہو گئے ہیں جہاز لی اسپرانس میں۔ اس لعنتی برٹش فلیگ شپ کارروف نے گولہ مار کر ڈبو دیا ہے۔ میں تختہ پکڑ کر آگیا ہوں۔ اگر تم جاننا چاہتے ہو تو میں ہوں لفٹیننٹ گاسپرڈ ڈی بیوہرنائی۔ تم نے یہ نام ضرور سُنا ہوگا"۔

"گاسپرڈ ڈی بیوہرنائی؟" فرانسیسی نے سر کھجایا۔

"ہاں ڈی بیوہرنائی۔ میں شہنشاہ نپولین کی ملکہ کا رشتہ دار ہوں اگرچہ دُور کا"۔

فرانسیسی رعب بلکہ دھوکہ کھا گیا۔ اس نے بندوق کو نیچے کر لیا بلکہ ایک عدد سیلوٹ داغا۔ "چلئے۔ ہمارے بڑے کمانڈنگ افسر آپ سے مل کر خوش ہوں گے"۔

کامٹن نے بہت ہوشیاری کو راہ دی تھی کہ اپنے پاس شناخت کا کوئی کاغذ نہیں رکھا تھا۔ کیونکہ جعلی کاغذ ہزار مہارت سے بنایا گیا ہو پکڑا جا سکتا ہے۔ اس نے یہ خوب بہانہ بنایا تھا کہ سارے کاغذات اور سامان ڈوب گئے۔

کمانڈنگ افسر نے اپنے آپ کو بہت معزز محسوس کیا کہ اُسے شاہی خاندان کے ایک فرد کی میزبانی حاصل ہے۔ کامٹن نے ہاتھ ملایا تاکہ اس کا کچھ بہتر مطالعہ کر سکے کامٹن بولا "افسرِ اعلیٰ! میں بہت بھوکا ہوں۔ میں پہلے کپڑا بدلنا اور پھر کھانا پسند کروں گا"۔

کپڑا اور کھانا دونوں آ گئے۔

"کیا آپ آرام کریں گے؟ اس کے بعد ہم آپ کو بحریہ پر ایک ڈیوٹی دیں گے"۔

"ڈیوٹی لینے سے پہلے میں پیرس جاکر ملکۂ فرانس یعنی اپنی آنٹی سے ملوں گا اور اُن کی پسند سے ڈیوٹی کا انتخاب کروں گا۔" کامٹن نے مزید رُعب جھاڑنے کے لیے کہا۔

کمانڈنگ افسر بولا" وائی وا۔ بونا پارٹی (نپولین کو فتح ہو) میں مشورہ دوں گا کہ آپ چوبیس گھنٹے آرام کریں اور اگر ملکۂ فرانس سے ملنا ضروری نہ ہو تو فوراً ڈیوٹی سنبھال لیں۔ آج کل جنگ کا زمانہ ہے اور ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ اگرچہ برطانیہ سے ابھی تک ہماری کوئی گرم جنگ نہیں ہے، لیکن ہم لڑائی کی سطح پر ہیں۔ برطانیہ سے قریب ترین ہمارا بحری جنگی محاذ نارمنڈی ہے۔ جہاں ہمیں بڑے ہوشیار تجربہ کار افسر کی ضرورت ہے۔ آپ پیرس میں ہمارے جنگی ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کریں۔"

"ہاں۔ آج میں آرام کروں گا۔"

کامٹن نے آرام کم کیا۔ زیادہ تر پلان کی نوک پلک درست کرتا رہا۔ اس وقت وہ اس نازک مقام پر تھا جہاں ذرا سی بھی غلطی ہو جائے تو اُسے گولیوں سے چھلنی کیا جا سکتا تھا۔ اب تک حالات خوب سازگار جا رہے تھے۔ لیکن ذرا سا قدم پھسلا اور ہمیشہ کے لیے غڑاپ۔

دوسری صبح وہ سو کر اُٹھا۔ اب تازہ دم ہو چکا تھا۔ اس نے ناشتہ فرانسیسی افسر کمانڈنگ کے ساتھ کیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی صحت کا جام پیا وائی وا بونا پارٹی کہہ کر۔ کامٹن اپنی بہترین فرانسیسی میں بولا" میں نارمنڈی کا انتخاب کرنے سے پہلے اِس شہر کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔ بہت پہلے دیکھا تھا۔"

"مناسب ہے۔"

شام ہونے سے پہلے پہلے وہ نارمنڈی میں تھے۔ شہر دیکھا، عوام دیکھے۔ جنگی اہمیت اور حفاظت کے علاقے دیکھے اور اخیر میں وہ قلعہ اندر جاکر دیکھا جہاں خطرناک ترین مجرمین اور جاسوس مقید رکھے جاتے ہیں۔

"سب سے خطرناک جاسوس کون ہے؟"

"یہ ہے ہمارا پوائنٹی۔ انگریزوں کا سب سے خطرناک جاسوس۔ اِسے دو ہفتے ہوئے ہم لوگوں نے پکڑا ہے۔ اب اس کا کورٹ مارشل ہونے والا ہے۔"

"کورٹ مارشل کوئی بہترین عقل مندی نہیں ہے افسر کمانڈنگ۔ بہترین عقل مندی ہے کہ ہم اسے برطانوی جاسوس سے فرانسیسی جاسوس بنالیں۔ اگر یہ ہماری طرف آگیا تو برطانیہ کے بہت سے راز ظاہر کر دے گا اور فرانس کے لیے بھی بہت مفید ثابت ہوگا۔ ویسے بھی فرانس کے پاس بہترین اور اعلیٰ ترین جاسوسوں کی کمی ہے۔"

"میں اس مسئلے پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔"

"جب تک میں اس ذلیل ترین قیدی سے رابطہ قائم کرتا ہوں اور اسے رضامند کرتا ہوں، فرانس کی طرف سے کام کرنے پر۔۔۔"

ڈان کامٹن نے قریب جاکر لمارا پوائنٹی سے برطانوی کوڈ (خفیہ) الفاظ میں سرگوشی کی "میں کنگ جارج بحریہ کا آدمی ہوں۔ تمھیں چھڑانے آیا ہوں۔ تم فرانسیسی جاسوس بن جانے پر مشکل سے راضی ہونا۔ آزادی ملتے ہی موقع پاکر سمندر میں کود پڑنا۔ میں بھی کود پڑوں گا۔ آگے خدا مالک ہے۔"

دوسرے دن افسر کمانڈنگ نے ڈان کامٹن کو خبر دی کہ لمارا پوائنٹی کو فرانس کی طرف سے جاسوسی کا کام کرنے پر راضی کیا جائے۔ افسر کمانڈنگ کی سرتوڑ کوششوں سے چند گھنٹوں میں لمارا پوائنٹی تیار ہوگیا۔ اُس کی زنجیریں کھول دی گئیں۔۔۔!

برٹش چینل میں فرانس کی طرف سمندر میں کیا جنگی انتظامات تھے۔ یہ دیکھنے کے لیے ایک فرانسیسی آبدوز کشتی تیار کی گئی جس میں ڈان کامٹن اور لمارا پوائنٹی بیٹھ گئے اور روانہ ہوئے۔ سات آٹھ میل جاکر انھوں نے اس آبدوز کے کریو کو ان ہی کی گولیوں سے مار ڈالا۔ پھر اس میں سے نکل کر سمندر میں کود گئے۔
ایڈمرل جان پرائسر کی ایک آبدوز نے انھیں لپک لیا۔ اب وہ آزاد تھے۔

●●●●

حق اسکواڈ

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سلسلۂ تحریر
اخلاق احمد کی مہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

- بُرائیوں سے برسرِ پیکار ۳ کمسن مجاہدوں کے کارنامے ۔
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات ۔
- خوبصورت اسکیچز —— بہترین کتابت —— اعلیٰ طباعت
- حسین سرِورق اور ۱۰۰ سے زائد صفحات ۔

قیمت صرف ۱۰ روپے

- حق اسکواڈ کے حصول کے لئے ۱۰ روپے کا منی آرڈر بھجوادیں ۔
- دوکاندار ایجنٹ حضرات آرڈر سے مطلع کریں ۔

پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی گرین گائیڈ اکیڈمی ڈی - ۱۱۲ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

ٹی وی اور ڈیڈی

شاہ نواز فاروقی

داخل ہوئے ہیں جب سے ٹی وی شریف گھر میں
رہنے لگا ہے تب سے اک درد میرے سر میں

گھر کا نظام سارا چوپٹ سا ہو گیا ہے
ہر ایک فرد گھر کا نٹ کھٹ سا ہو گیا ہے

بیوی بدل گئی ہے بچے بدل گئے ہیں
ہاتھوں سے یعنی میرے سارے نکل گئے ہیں

کھانے میں شام کے اب پہلا مزا نہیں ہے
بچوں پہ پہلے جیسا اب دبدبہ نہیں ہے

بیوی پہ بھی ہمارا پہلا سا بس نہیں ہے
بچوں کی گفتگو میں پہلا سا رس نہیں ہے

معصومیت سے بچے اب دور ہو گئے ہیں
انسان سے زیادہ لنگور ہو گئے ہیں

لڑنے لگے ہیں بچے آپس میں اتنا زیادہ
لگتا ہے جیسے سب نے یہ کر لیا ارادہ

ہو کر بڑے وہ سارے رسلر بنیں گے جیسے
یا اس سے آگے بڑھ کر ٹائسن بنیں گے جیسے

سچ ہے کہ میرے بچے بیکار ہو گئے ہیں
تعلیم و تربیت سے بیزار ہو گئے ہیں

جس وقت دیکھو گھر میں ٹی وی کی ہاؤ ہو ہے
کھیلوں پہ تبصرہ ہے نغموں پہ گفتگو ہے

پہلے سے بڑھ گئیں ہیں فرمائشیں سبھی کی
صورت بگڑ گئی ہے پیار و مری خودی کی

فکر و عمل کے سارے رستے بدل دیئے ہیں
ٹی وی نے میرے گھر کے ہیرو بدل دیئے ہیں

ٹی وی نے میرے گھر کو جنگل بنا دیا ہے
آسان زندگی کو مشکل بنا دیا ہے

سب سے اونچا سپاہی

صباحت شکیل

"قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں" یہ محاورہ آپ نے سینکڑوں بار سُنا ہوگا، لیکن اگر اس محاورے کو جیتی جاگتی صورت میں دیکھنا ہو تو امریکی ریاست فلوریڈا کی پولیس کے ایک سپاہی پیم بروک بروز کو دیکھا جا سکتا ہے۔ سات فٹ قد رکھنے والا یہ سپاہی پچھلے پندرہ سال سے شاہراہوں کی نگرانی کرنے والی پولیس کے محکمے میں ملازم ہے۔

پیم بروک بروز بچپن سے ہی پولیس کی ملازمت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ تاہم ابتدا میں وہ اپنے قد کی مناسبت سے کچھ عرصے کے لیے باسکٹ بال کے کھلاڑی بھی رہے۔ اور جب پہلی بار انھوں نے پولیس کے محکمے میں ملازمت کے لیے درخواست دی تو اُن کی درخواست کو ان کے لمبے قد کی وجہ سے رد کر دیا گیا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ وہ محکمۂ پولیس کے سربراہ سے ملے اور انھیں بالآخر خصوصی رعایت دیتے ہوئے پولیس کی ملازمت کے لیے اہل قرار دے دیا گیا۔ ملازمت کے بعد جو چیز محکمے کے لوگوں اور خود پیم کے لیے پریشان کُن تھی وہ یہ کہ وہ شاہراہوں کی نگرانی کے لیے ملنے والی کار کو کس طرح چلائیں گے؟ بہت غور و خوض کے بعد یہ طے ہوا کہ ان کی کار میں ڈرائیور کی سیٹ کو نارمل جگہ سے ۸ انچ پیچھے کر دیا جائے۔ پیم کا کہنا ہے کہ کار کو اتنے پیچھے بیٹھ کر چلانا اتنا غیر آرام دہ نہیں ہے جتنا کہ عام لوگوں کو نظر آتا ہے۔ البتہ انھیں کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ وہ کار کو پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ڈرائیو کر رہے ہیں۔

بلند قامت ہونے کے باعث پیم عام افراد کے لیے دلچسپی کا سبب بنے رہتے ہیں۔ پیم کے مطابق جب وہ غلط ڈرائیونگ پر کسی کار کو روک کر کار کے ڈرائیور کے پاس جاتے ہیں تو اُس کا منہ حیرت سے کھلا رہ جاتا ہے اور جب وہ ڈرائیور کو چالان کاٹ کر دیتے ہیں تو اکثر لوگ اُن سے کہتے ہیں "کیا ہم آپ سے ایک سوال کر سکتے ہیں؟" اور پیم اُن کے اس سوال کے جواب میں مُسکرا کر کہتے ہیں "جی ہاں میرا قد سات فٹ ہے۔"

پیم کا خیال ہے کہ اُن کے بُلند قد و قامت کے باعث شاہراہوں پر قانون شکنی کے واقعات میں کمی ہوئی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جب وہ ایسے ڈرائیوروں کی گاڑیاں روک کر اُنھیں گاڑی سے باہر آنے کے لیے کہتے ہیں جو خطرناک ڈرائیونگ کر رہے ہوتے ہیں تو ڈرائیور حضرات اُن کے قد و قامت کو دیکھتے ہوئے نہایت شریفانہ انداز میں گاڑی سے اُتر آتے ہیں۔

پیم کی پندرہ سالہ پولیس ملازمت کا سب سے دلچسپ ترین واقعہ اُس وقت رونما ہوا جب انھوں نے ۱۸ پہیوں والے ایک لمبے ٹرک کو روکا۔ پیم جب چلتے ہوئے ٹرک کے قریب پہنچے تو ڈرائیور نے کھڑکی سے جھانک کر غصّے سے کہا "ٹرک کے پائیدان سے نیچے اُترو۔" اور جب پیم نے کہا کہ میں پائیدان پر نہیں زمین پر کھڑا ہوں تو اُس ڈرائیور نے حیرت سے کھڑکی سے جھانک کر پیم کے پیروں کی طرف دیکھا اور پھر منہ اُٹھا کر پیم سے قدرے خوف زدہ ہو کر کہا "جناب میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔؟"

●●●

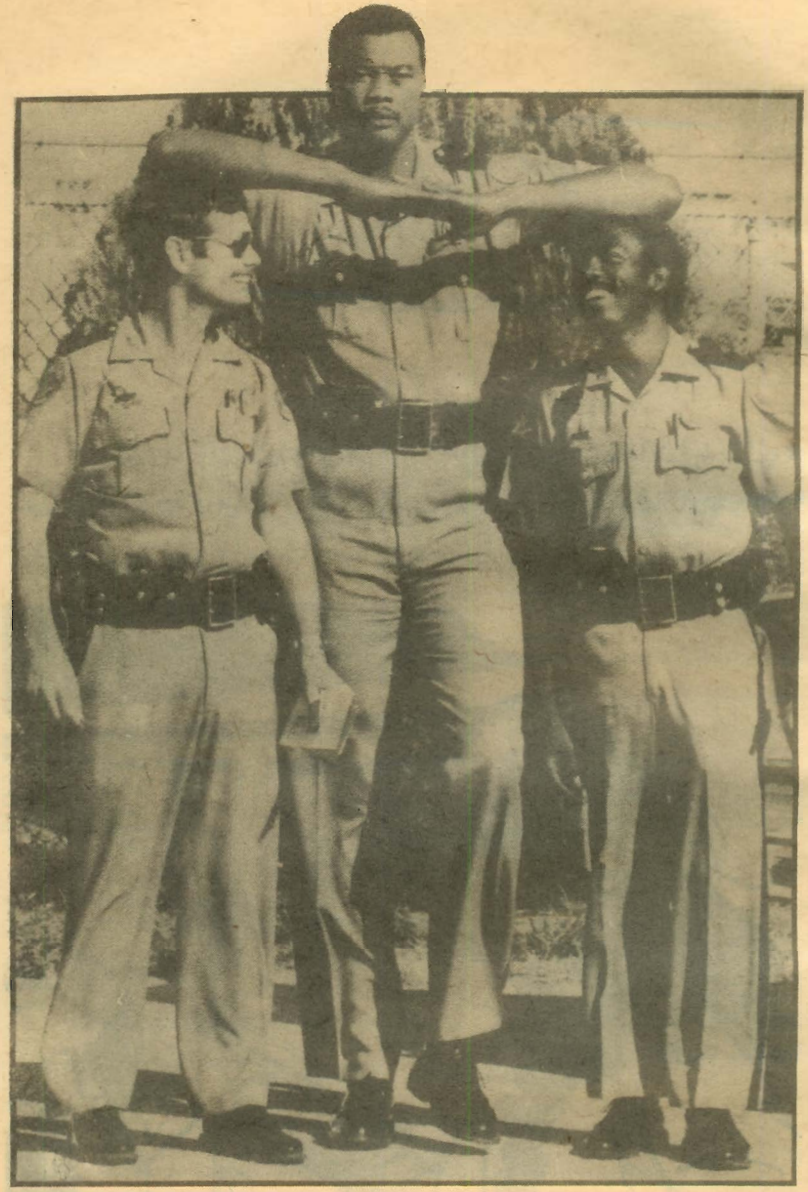

اسٹیشن ماسٹر

سیّد عرفان علی یوسف

ریحانہ نے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو شام کے پانچ بج چکے تھے۔ یکّہ سے اُتر کر پلیٹ فارم کی چھت کے نیچے پہنچتے پہنچتے وہ خاصی بھیگ گئی تھی۔ بارش اسی رفتار سے ہو رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔ اگرچہ سورج کے ڈوبنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا لیکن پلیٹ فارم کی بتّیاں روشن ہو گئی تھیں کیونکہ ابھی سے گھٹاٹوپ،

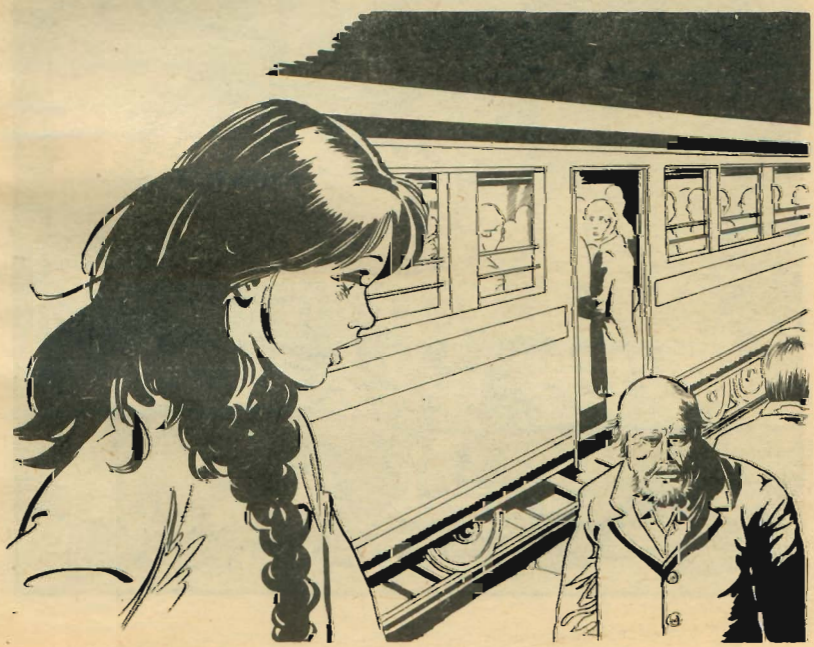

اندھیرا چھا گیا تھا۔ اسٹیشن پر مسافروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ صرف وہی لوگ یہاں نظر آ رہے تھے جو دوسرے علاقوں سے اس قصبہ میں ملازمت کے لیے آتے تھے۔

ریحانہ ٹکٹ گھر کی طرف بڑھی۔ کھڑکی پر بیٹھے ہوئے نصیر بابا حسبِ معمول کوئی موٹا سا ڈائجسٹ پڑھ رہے تھے۔ ریحانہ کو دیکھ کر انھوں نے ڈائجسٹ رکھ دیا اور بولے "ریحانہ بی بی! آج تو آپ کو اسکول نہیں آنا چاہیئے تھا۔ ایسے موسم میں تو چھٹی کر لیتیں۔"

"بابا" ریحانہ نے کہا "آج میرا میوزک کا امتحان تھا نا۔ اس لیے میں چھٹی نہیں کر سکتی تھی۔"

نصیر بابا نے ایک روپے کا ٹکٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ ریحانہ نے اپنا وائلن کیس دیوار کے ساتھ رکھا اور پرس سے ریزگاری نکال کر گننے لگی۔ سردی سے اس کے ہاتھ ٹھٹھر رہے تھے اور سکّے انگلیوں سے پکڑے نہیں جا رہے تھے۔ ٹھنڈ سے اسے کانپتے دیکھ کر نصیر بابا بولے "بیٹا! ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ آتشدان میں ابھی تک آگ دہک رہی ہے اور کمرہ کافی گرم ہے۔"

ریحانہ نے ایک روپے کی ریزگاری دے کر ٹکٹ اٹھایا اور پرس میں رکھ لیا۔ اس کے بعد وائلن کیس اٹھایا اور ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ دوسرے تمام پرانے اسٹیشنوں کی عمارتوں کی طرح اس اسٹیشن پر بھی پرانے کمرے گرائے جا رہے تھے کیونکہ ان کی جگہ نئے کمرے بننے تھے۔ اس اسٹیشن کی عمارت کوئی ایک سو سال پرانی تھی اور لکھوری سُرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم کی چھت لکڑیوں اور بلّیوں کی بنی ہوئی تھی جس کا اندرونی حصّہ ریلوں کے دھوئیں سے سیاہ ہو چکا تھا۔ ویٹنگ روم آتشدان میں دہکنے والے انگاروں کی وجہ سے خاصا گرم تھا۔ اندر کوئی مسافر موجود نہیں تھا۔ ریحانہ کمرے کے درمیان گول میز کے قریب ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی یہاں سے باہر کا منظر نظر آ رہا تھا۔ سیاہ گھٹا تیزی سے برستے ہوئے جنوب کی طرف جا رہی تھی۔ پرناوں سے پانی گر رہا تھا اور گلیوں میں بھی گھٹنے گھٹنے پانی تھا۔

کمرہ خاصا بڑا تھا۔ دیوار کے ساتھ چاروں طرف لکڑی کی قدیم بنچیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک جانب پرانا سا آئینہ تھا۔ کمرے کا سارا فرنیچر کم از کم پچاس سال پرانا اور خاصا بھاری تھا۔ یہ اسٹیشن آزادی سے بہت پہلے انگریزوں نے بنوایا تھا۔ کیونکہ اس قصبہ میں ایک فوجی چھاؤنی بھی تھی۔ اور فوجی ٹرینیں یہاں تک آیا کرتی تھیں۔ اس لائن پر اُس وقت شاید یہ آخری اسٹیشن تھا۔ اب اس لائن کو آگے بڑھا دیا گیا تھا۔ اور اس اسٹیشن سے آگے چالیس پچاس میل دور نصر پور تک ریلوے لائن بچھا دی گئی تھی۔

ریحانہ کچھ دیر ویٹنگ روم سے باہر بارش کا تماشا دیکھتی رہی یہاں تک کہ تاریکی اتنی بڑھ گئی کہ باہر کا منظر نظر آنا بند ہو گیا۔ ریحانہ نے اپنا وائلن کیس اٹھایا۔ اس میں سے وائلن نکال لیا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی پندرہ منٹ

تھے، لیکن بارش کی وجہ سے وہ مزید لیٹ ہو سکتی تھی۔ ریحانہ پبلک اسکول میں پڑھتی تھی۔ جہاں اُسے دوسرے مضامین کے علاوہ موسیقی کا امتحان بھی دینا تھا۔ وہ اپنے اسکول کی بینڈ ٹیم میں شامل تھی اور اب تک وہ بہت اچھا وائلن بجانا سیکھ چکی تھی۔

ریحانہ نے وائلن بجانا شروع کر دیا۔ تنہا کمرے میں وائلن کی آواز خوب گونج رہی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ ریحانہ نے ہاتھ روک لیے اور حیرت سے آنے والے کو دیکھنے لگی۔

"بیٹا معاف کرنا" آدمی بولا "میں تمھارے وائلن کی آواز سُن کر اندر آ گیا۔ تم بہت اچھا بجاتی ہو۔ میں تمھیں ڈسٹرب نہیں کروں گا تم وائلن بجاتی رہو۔"

اپنی تعریف سُن کر ریحانہ خوش ہو گئی۔ اجنبی لمبا تڑنگا اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ چہرے پر سفید داڑھی تھی۔ وہ سفید وردی پہنے ہوئے تھا۔ جس پر پیتل کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ بٹن روشنی میں خوب چمک رہے تھے۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے گھڑی نکالی اور وقت دیکھتے ہوئے بولا "تمھاری ٹرین آنے میں ابھی پندرہ منٹ ہیں۔"

"آپ کون ہیں؟" ریحانہ نے تجسس سے پوچھا۔

"میں اسٹیشن ماسٹر ہوں۔ میرا نام خدا بخش ہے" اس نے کہا۔ ریحانہ نے اطمینان کا سانس لیا اس کی نظر اس کے پیتل کے بٹنوں پر پڑی۔ ان پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ جُھک کر بٹنوں پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے لگی۔ بٹنوں پر این، ڈبلیو، آر، لکھا ہوا تھا۔ اس نے اس سے پہلے کسی ریلوے ملازم کو نہ تو ایسا کوٹ پہنے دیکھا تھا اور نہ بٹنوں پر تحریر دیکھی تھی۔ وہ ریلوں پر پی۔ آر یعنی پاکستان ریلوے لکھا دیکھنے کی عادی تھی۔ اس لیے اس نے پوچھا "سر، این ڈبلیو آر کا کیا مطلب ہے؟"

اسٹیشن ماسٹر مسکرایا اور بولا "تم بہت ذہین ہو، این ڈبلیو آر کا مطلب ہے نارتھ ویسٹرن ریلوے۔ بھئی تم بہت دیر کر رہی ہو۔ ریل آنے سے پہلے تم ہمیں اپنے وائلن پر ایک نغمہ سُنا دو۔"

ریحانہ کو اُس کے لہجے سے وقت کے تیزی سے گزرنے کا احساس ہوا۔ اور اس نے مزید کوئی سوال کیے بغیر وائلن بجانا شروع کر دیا۔ اسٹیشن ماسٹر بڑی دلچسپی اور شوق سے اس کا نغمہ سُنتا رہا۔ جب ریحانہ نے نغمہ ختم کیا تو وہ بولا "بہت خوب بہت خوب۔ بیٹا جب میں تمھارے برابر کا تھا تو میں بھی وائلن خوب بجایا کرتا تھا۔"

ریحانہ نے اپنا وائلن اس کی طرف بڑھایا اور بولی "آپ بھی اپنے بچپن کی یاد میں کچھ گائیے نا" وہ ہنسا اور ریحانہ سے وائلن لے لیا۔ وہ چند لمحے وائلن کی کنجیوں پر یونہی انگلیاں دوڑاتا رہا۔ پھر اُس نے جو نغمہ شروع کیا وہ کوئی چالیس پچاس سال پرانی دُھن تھی جو اُس زمانے میں مقبول رہی ہوگی۔ یہ شاید ساون کا کوئی گیت تھا۔ جو وہ وائلن کے

ساتھ گا رہا تھا۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک اور بارش کی تیز آواز کے ساتھ ساون کا یہ گیت ریحانہ کو بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ وہ موسیقی کے سحر میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر نہ صرف بہت اچھا وائلن نواز تھا بلکہ اس کی آواز بھی اچھی تھی حالانکہ اس کی داڑھی کے بال بالکل سفید تھے اور اس کی عمر ۶۰ سال سے کم نہیں تھی۔ جب اس نے نغمہ ختم کیا تو ریحانہ بولی "آپ اتنا خوبصورت بجاتے ہیں کہ میں نے اس سے پہلے اتنا اچھا نغمہ نہیں سُنا۔ کوئی اور دُھن سُنائیے نا۔" اسٹیشن ماسٹر نے فوراً ہی دوسرا نغمہ شروع کر دیا۔ یہ بھی ساون ہی کا کوئی گیت تھا، جو موسم کی مناسبت سے بے حد خوبصورت اور حسین تاثر دے رہا تھا۔ جب اُس نے یہ نغمہ مکمل کیا تو ریحانہ نے اس سے یہی نغمہ دوبارہ سنانے کی فرمائش کی۔ "نہیں بیٹا" وہ بولا۔ "تم یہ نغمہ آج دوبارہ نہیں سُن سکتیں کیونکہ اب میں جانا چاہتا ہوں۔" اُس نے وائلن میز پر رکھ دیا۔ اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اس نے اپنی جیب سے گھڑی نکالی، وقت دیکھا اور خدا حافظ کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

"خدا حافظ" ریحانہ نے موسیقی کے سحر سے باہر آتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے کرسی پر ساکت بیٹھی رہی پھر اُس نے اپنا وائلن اٹھا کر کیس میں رکھا اور کھڑی ہو گئی۔ اچانک اس کی نظر اپنی گھڑی پر پڑی "اوہ" وہ وقت دیکھتے ہوئے چلائی "ساڑھے پانچ بج گئے۔" اُس نے اپنا وائلن کیس اٹھایا اور کمرے سے باہر بھاگی۔ بارش اب رُک چکی تھی لیکن پانی اسی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ اُس نے پلیٹ فارم پر پہنچ کر دیکھا سگنل سُرخ تھا۔ پلیٹ فارم مسافروں سے بالکل خالی تھا۔ دُور دُور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ اُس نے گھوم کر بے یقینی سے اس طرف دیکھا جدھر ٹرین کو جانا تھا کوئی ایک میل دُور ٹرین کی سُرخ روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ٹرین اس کے پلیٹ فارم پر آنے سے چند منٹ پہلے گزر گئی تھی۔ "اوہ" ریحانہ نے خود کو بُرا بھلا کہتے ہوئے سوچا "وہ کتنی احمق ہے کہ ریل آئی اور چلی گئی اور اُسے وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ اب دوسری ٹرین کم از کم ایک گھنٹے کے بعد آئے گی" اُس نے سوچا۔

پریشانی کے عالم میں وہ ٹکٹ گھر کی طرف چل دی۔ دل ہی دل میں وہ اسٹیشن ماسٹر کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی ریل نکل گئی تھی۔ اُس نے کھڑکی سے جھانک کر ٹائم ٹیبل دیکھا۔ دوسری ٹرین ساڑھے چھ بجے آتی تھی۔ "گویا اسے پورا ایک گھنٹہ انتظار کرنا تھا۔" مجھے اپنے گھر ٹیلیفون کر دینا چاہیئے" اُس نے سوچا اس کے ابو اسے لینے دوسرے اسٹیشن پر آئیں گے اور اُسے نہ پا کر پریشان ہوں گے۔ اسے ٹکٹ گھر میں کوئی ٹیلیفون نظر نہیں آیا۔ ٹکٹ گھر کا کلرک نصیر بابا بھی موجود نہیں تھا۔ اُس نے پریشانی کے عالم میں اس کمرے کی طرف دیکھا جس پر اسٹیشن ماسٹر لکھا ہوا تھا۔ لیکن کمرہ بند تھا اور دروازے پر تالا لٹکا ہوا تھا۔ اس نے پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ پلیٹ فارم پر چند آوارہ گرد فقیروں کے علاوہ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ اسٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر جہاں اُس کا اسکول تھا وہیں ایک پبلک ٹیلی فون بُوتھ بھی تھا۔ بارش رُکی ہوئی تھی اور وہ اس بوتھ تک پہنچ سکتی تھی چنانچہ اُس نے اپنا وائلن کیس

اٹھایا اور اسٹیشن سے باہر نکل کر سڑک پر آگئی۔ سڑک ابھی تک پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اسے اپنا وائلن کیس اٹھا کر چلنے میں خاصی پریشانی ہو رہی تھی۔ بوتھ پر پہنچ کر اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور اندر گھس گئی۔ کیس اُٹھا کر نیچے رکھا۔ ٹیلی فون ماؤتھ پیس ہاتھ میں لیا اور فون بکس میں ایک سکّہ ڈال کر اپنے گھر کا نمبر گھمانے لگی۔ شاید بارشوں کی وجہ سے ٹیلی فون کا نظام بھی متاثر ہوا تھا۔ کئی مرتبہ گھمانے کے باوجود وہ ٹیلی فون کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے گھر کا نمبر مل ہی نہیں رہا تھا۔ جھنگ آکر وہ بوتھ سے باہر نکلی اور اسٹیشن کی طرف واپس چل دی۔ ٹکٹ گھر میں نصیر بابا واپس آچکے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ بولے "ارے بیٹا۔ تم کہاں تھیں، میں سمجھا تھا کہ تم اس ٹرین سے چلی گئیں"۔

ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ وہ بار بار اپنے ہاتھ مَل رہے تھے۔ "میں ٹیلی فون کرنے گئی تھی" وہ ناراضگی سے بولی۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمھاری ٹرین چھوٹ گئی" انھوں نے کہا۔

"اوہ تو اس میں خوشی کی کیا بات ہے" وہ چڑ کر بولی۔

"بیٹا اللہ جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے" نصیر بابا نے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے اطلاع آئی ہے کہ یہاں سے صرف دو میل آگے وہ ٹرین پٹری سے اُتر گئی ہے کیونکہ بارش کے سیلابی پانی سے پٹری بہہ گئی ہے"۔

ریحانہ کو کچھ دیر اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ "آؤ! تم میرے دفتر میں آکر بیٹھ جاؤ" نصیر بابا نے کہا۔ ریحانہ کو ہر چیز عجیب اور غیر یقینی لگ رہی تھی۔ نصیر بابا نے اُس کے ہاتھ سے وائلن کیس لے لیا۔ وہ کمرے میں آتشدان کے سامنے چمڑے کی چمکدار آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ حادثے کی خبر سے اس کے ذہن کو جھٹکا لگا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اسٹیشن ماسٹر ویٹنگ روم میں نہ آتا تو وہ یقیناً اسی ٹرین میں سوار ہو جاتی جو پانی میں بہہ گئی تھی۔ اس نے خوف سے جھرجھری لی اور بولی "بابا، میں اپنے گھر فون کرنا چاہتی ہوں"۔

"کوئی بات نہیں" نصیر بابا نے کہا "ٹیلی فون تو یہیں موجود ہے۔" نصیر بابا نے ایک دراز کھول کر ٹیلی فون باہر نکالا۔

"تمھارے گھر کا کیا نمبر ہے" انھوں نے پوچھا۔

"ٹو ڈبل ون ایٹ ناٹن" وہ بولی۔

"میں ابھی تک حیران ہوں کہ تم ٹرین کیوں نہیں پکڑ سکیں" وہ بولا۔

"میں ویٹنگ روم میں وائلن بجا رہی تھی کہ آپ کے اسٹیشن ماسٹر آگئے" وہ بولی "انھوں نے میرا نغمہ سُنا اور بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد انھوں نے خود بھی دو دُھنیں سُنائیں"۔

نصیر بابا نے ہاتھ روک لیا اور بے یقینی سے بولے "کیا کہا اسٹیشن ماسٹر، لیکن اس اسٹیشن پر تو دو مہینے سے کوئی اسٹیشن

ماسٹر نہیں ہے۔ یہاں صرف ہم دو ملازم ہیں۔ ایک میں اور دوسرا صبح کی شفٹ میں عالی۔"

"کیا عالی صاحب لمبے تڑنگے ہیں اور ان کی سفید داڑھی بھی ہے" ریحانہ بولی۔

"نہیں، وہ تو پچیس تیس سال کا نوجوان آدمی ہے۔" نصیر بابا بولے۔

"اوہ" ریحانہ نے بے یقینی سے کہا۔ "لیکن وہ آدمی اپنی یونیفارم سے اسٹیشن ماسٹر لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر سفید داڑھی تھی اس کی عمر کم از کم پچپن یا ساٹھ سال تھی۔ اُس نے جو وردی پہنی ہوئی تھی اس کے بٹنوں پر این ڈبلیو آر لکھا ہوا تھا۔"

"بیٹا" نصیر بابا بولے "میرا خیال ہے کہ آپ سو گئی تھیں اور آپ نے خواب میں اس اسٹیشن ماسٹر کو دیکھا تھا۔ کیونکہ این ڈبلیو آر تو آج سے چالیس سال پہلے لکھا ہوا تھا جس کا مطلب ہے نارتھ ویسٹرن ریلوے۔"

ایک کار اسٹیشن کے باہر آکر رُکی اور کار سے ریحانہ کے ابّو گھبرائے ہوئے اُترے۔ ریحانہ نے باہر دیکھا تو بولی۔

"ابّو۔ میں یہاں ہوں۔"

"خدا کا شکر ہے۔" اس کے ابّو نے کہا۔ "تم اس ٹرین میں نہیں تھیں۔" وہ اپنے ابّو کی بانہوں میں سما گئی۔

"لیکن تم سے وہ ٹرین کیسے چھوٹ گئی۔" اس کے ابّو بولے۔

"ابّو... اسٹیشن ماسٹر صاحب نے مجھے روک لیا تھا اس دوران ٹرین نکل گئی۔" وہ بولی۔

"لیکن یہاں کوئی اسٹیشن ماسٹر نہیں ہے۔" نصیر بابا نے کہا۔

"تم نے ضرور خواب دیکھا ہوگا۔" ریحانہ کے ابّو بولے۔

"نہیں۔" ریحانہ بولی "وہ خواب نہیں تھا۔" پھر اس نے اسٹیشن ماسٹر سے اپنی گفتگو تفصیل سے بیان کی۔

نصیر بابا بے یقینی سے سُنتے رہے پھر بولے "اس کا نام کیا تھا؟"

"خدا بخش۔ اس نے یہی نام بتایا تھا۔" وہ بولی۔

"دیکھو بھئی" نصیر بابا بولے "میں اس نام سے واقف ہوں، لیکن خدا بخش اس وقت یہاں اسٹیشن ماسٹر تھا جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اور میرے والد یہاں کام کرتے تھے۔"

وہ حیرت سے اس کی بات سُنتی رہی۔

نصیر بابا مُسکرائے۔ پھر بولے "تم نے ضرور خدا بخش کے بارے میں کسی پُرانے اخبار یا رسالے میں اس کی کہانی پڑھی ہوگی اور سوچا ہوگا کہ لوگوں کو اس سے ملاقات کی کہانی سُنا کر حیران کر دیا جائے۔"

"کیسی کہانی" وہ بولی۔

"میں اس وقت اسکول میں پڑھتا تھا۔ جب ایسی ہی ایک طوفانی بارش میں یہاں ایک ٹرین بہہ گئی تھی۔ خدا بخش اسٹیشن ماسٹر تھے۔ جب انھیں ٹرین کے حادثے کی خبر ملی تو وہ لالٹین لے کر تنہا حادثے کے مقام کی طرف بھاگے، لیکن اس کے بعد ان کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خود بھی تیز پانی کے بہاؤ میں بہہ گئے۔"

"اُف خدایا" ریحانہ نے کہا۔ "انھوں نے لوگوں کو بچانے کے لیے اپنی جان دے دی۔"

"لیکن" وہ بولی "میری جس سے ملاقات ہوئی وہ کوئی اور ہوگا۔ وہ ایک زندہ آدمی تھا۔ وہ خدا بخش کی روح نہیں ہو سکتی۔ میں نے اُسے چھُو کر دیکھا تھا۔"

اس کے ابّو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے "ریحانہ بہتر ہے کہ تم اب گھر چلو۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟" وہ بولی۔

"ایک آدمی نے بتایا" وہ بولے۔ دفعتاً ان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ "تم نے اس اسٹیشن ماسٹر کا کیا حلیہ بتایا تھا؟" انھوں نے کہا۔

"وہ لمبا تڑنگا۔ سُرخ سفید آدمی تھا۔ اُس کی آنکھیں نیلی تھیں" ریحانہ نے کہا "اس کے چہرے پر سفید داڑھی تھی۔"

"جب میں اسٹیشن پہنچا اور مجھے حادثے کی اطلاع ہوئی تو میں بے حد پریشان ہوا۔" ریحانہ کے ابّو نے کہا۔ "اُسی وقت اسی شکل وصورت کا ایک آدمی میرے پاس آیا اور اُس نے بتایا کہ ریحانہ خیریت سے ہے اور اسی اسٹیشن پر ہے۔"

"ایک آدمی دو جگہ کیسے ہو سکتا ہے" وہ حیرت سے بولی۔

"کیا وہ اس کی روح تھی جس نے مجھے اس ٹرین پر سوار ہونے سے روک دیا جو حادثے کا شکار ہو گئی"

"خیر اب آپ یہ سب بھول جائیے" نصیر بابا نے کہا۔ "لیکن آپ ساون کے گیت بہت اچھے گاتی ہیں۔ میں نے آج سُنے جب آپ وائلن بجا رہی تھیں۔"

"مجھے ساون کے گیت نہیں آتے۔" وہ حیرت سے بولی۔ پھر اُسے یاد آیا۔ ساون کے وہ گیت اسٹیشن ماسٹر گا رہا تھا یا شاید اس کی روح تھی۔

(انگریزی سے ماخوذ)

قرآنی آیات، احادیث مبارکہ اور مقدس نام آپ کے مطالعے اور معلومات کے لئے شائع کئے جاتے ہیں۔ ان کا احترام اور انہیں بے حرمتی سے بچانا آپ کا دینی فرض ہے۔ اگر کوئی ایسا کاغذ کہیں گرا ہوا نظر آجائے جس پر آیات، احادیث یا متبرک نام لکھے ہوتے ہوں تو آپ انہیں کسی محفوظ مقام پر رکھ دیں یا پاک صاف پانی میں بہا دیں۔

ہے نا حیرت کی بات

یہ جو مینڈک صاحب ہاتھ پر بیٹھے مسکرا رہے ہیں اس قدر معصوم بھی نہیں ہیں، اِن کا شمار دنیا کے بڑے مینڈکوں میں ہوتا ہے ان کی عمر ۸ سال ہے یہ نو انچ چوڑے ہیں اور جب ان کے پیٹ میں بھوک کے مارے چوہے دوڑتے ہیں تو یہ زندہ چوہوں کو بھی نہیں چھوڑتے انھیں بھی ڈکار جاتے ہیں۔

میرین لینڈ فرانس کی یہ مچھلیاں انسانوں کے ساتھ مل کر کھیل تماشے دکھانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ اس تصویر میں نظر آنے والا غوطہ خور اسی طرح مچھلیوں کے ساتھ پانی کی تہہ میں چلا جاتا ہے اور پھر اسی طرح ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر باہر آجاتا ہے۔

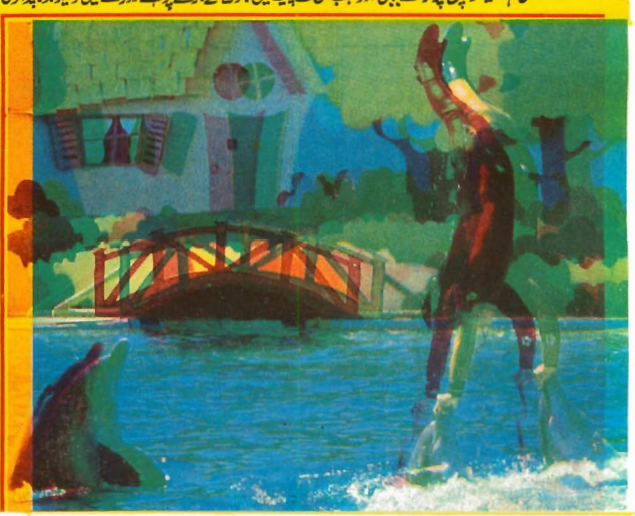

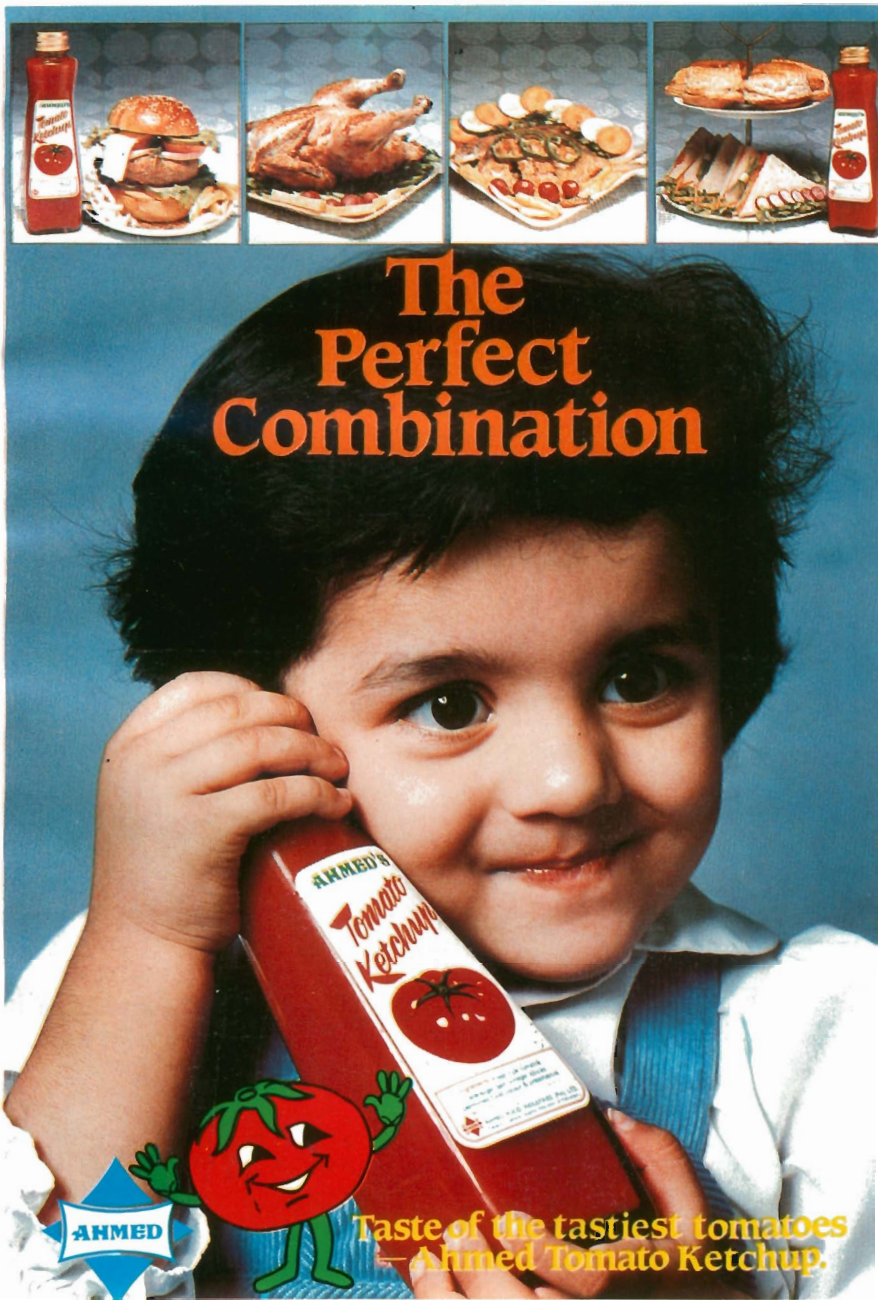

The Perfect Combination
AHMED'S
Tomato Ketchup
AHMED
Taste of the tastiest tomatoes
—Ahmed Tomato Ketchup.

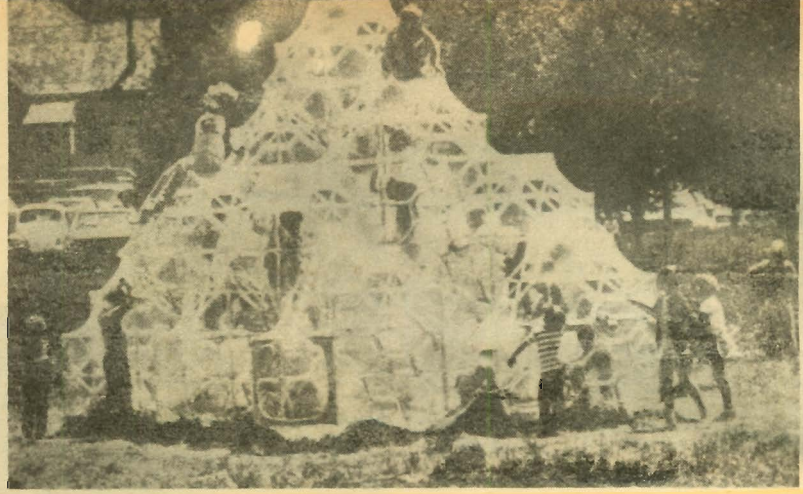

کیسی اچھی بھول بھلیاں

حارث شمیم

کیا آپ کو معلوم ہے کہ بار بار بھولنے والے کو کیا کہا جاتا ہے؟ "بھلکڑ" ہم میں سے شاید ہی کوئی بھلکڑ بننا یا خود کو بھلکڑ کہلوانا پسند کرے گا۔ اور کوئی ہمیں اس خطاب سے نوازے تو ہم اس پر ناراض ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے چاہے ہم واقعی بھلکڑ کیوں نہ ہوں۔ لیکن کتنی مزے کی بات ہے کہ ایک جگہ ایسی ہے جہاں ہم جاتے ہی بار بار بھولنے یعنی بھلکڑ بننے کے لئے ہیں۔ اور اس جگہ کو کہتے ہیں "بھول بھلیاں"۔

آپ میں سے اکثر نے لاہور کے گلشنِ اقبال پارک میں واقع بھول بھلیاں ضرور دیکھی ہوگی یا اس کا تذکرہ سنا ہوگا۔ لاہور کے گلشنِ اقبال پارک میں واقع یہ بھول بھلیاں پتھروں اور سیمنٹ وغیرہ کے آمیزے سے تیار کی گئی ہے۔ لیکن ہم آج آپ کو ایک ایسی بھول بھلیاں سے متعارف کرا رہے ہیں جو دنیا بھر میں اس اعتبار سے منفرد نوعیت کی حامل ہے کہ یہ پتھروں وغیرہ کی بجائے پلاسٹک سے بنائی گئی ہے اور یہ امریکہ کے شہر کولوریڈو کے اسپین پارک میں واقع ہے۔ بھول بھلیاں کا یوں تو کوئی نام نہیں ہے لیکن اگر آپ چاہیں تو اسے پلاسٹک کی ٹیڑھی میڑھی بھول بھلیاں کہہ سکتے ہیں۔

یہ عجیب و غریب بھول بھلیاں کیلی فورنیا کے ایک سائنسدان پیٹر پیرس نے بنائی ہے۔ یہ بھول بھلیاں پانچ ٹیڑھے میڑھے حصوں پر مشتمل ہے۔ ان حصوں کو آپس میں جوڑ کر آپ جس طرح چاہیں ہر بار ایک نئی بھول بھلیاں تعمیر کر سکتے ہیں۔ یہ بھول بھلیاں پوری کی پوری پلاسٹک سے بنی ہے صرف داخل ہونے اور باہر نکلنے کا راستہ دھات کی رنگ برنگی گول پٹیوں سے بنا ہوا ہے۔

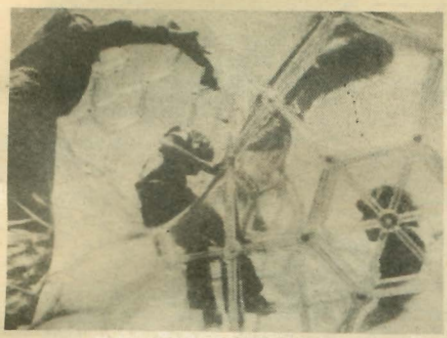

اس بھول بھلیاں کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں بچے ایک جگہ سے دوسری جگہ چل کر بھی جا سکتے ہیں اور پھسل کر بھی پلاسٹک کی بنی ہونے کی وجہ سے بھول بھلیاں انتہائی نرم اور لچکیلی ہے۔ چنانچہ بچوں کے چوٹ لگنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کا وزن بھی بے حد کم ہے اور بچے اس کے پانچوں ٹکڑوں کو بہ آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتے ہیں۔ یعنی بچے ایک طرح کی بھول بھلیاں سے اُکتا جائیں تو اس کے ٹکڑوں کو کسی دوسرے مقام پر لے جا کر نئی طرح سے جوڑ کر نئی بھول بھلیاں بنا سکتے ہیں۔

اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس بھول بھلیاں کو بنانے کا خیال پیٹر پی پریس کے ذہن میں کیسے آیا؟ تو ہوا یہ کہ پیٹر صاحب ایک بار کہیں جا رہے تھے کہ انہوں نے راستے میں بچوں کو صابن اور پانی سے بلبلے بنا کر اڑاتے ہوئے دیکھا۔ ہوا میں اڑتے ہوئے بلبلوں کو دیکھ کر پیٹر پریس کو خیال آیا کہ یہ بلبلے نہ صرف یہ کہ وزن میں بہت ہلکے ہیں بلکہ ان کی سطح کا تناؤ بھی بہت زیادہ ہے چنانچہ انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ ایسی صورت کی بنیاد پر کوئی نئی چیز بنائی جائے۔

اس خیال کے آتے ہی پیٹر صاحب اپنے کام میں لگ گئے اور بالآخر انہوں پلاسٹک کی یہ عجیب و غریب بھول بھلیاں بنا ڈالی ان کی بنائی ہوئی اس بھول بھلیاں کی تصویر دیکھ کر آپ کو محسوس ہوگا کہ صابن کے کئی بڑے بڑے بلبلے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

لوگ جب اس بھول بھلیاں کو پہلی بار دور سے دیکھتے ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے؟ کوئی اسے جادوئی قلعہ سمجھتا ہے اور کوئی دوسرے سیارے سے آیا ہوا خلائی جہاز حالانکہ یہ تو صرف بھول بھلیاں ہے جس میں بچے کے بچے راستہ بھول جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر

پرستان کی سیر

آپ نے سینکڑوں کہانیاں پڑھی اور سنی ہوں گی جو قریب قریب ایک ہی طرح سے شروع ہوتی ہیں یعنی "کسی زمانے میں ایک بادشاہ رہا کرتا تھا۔۔۔" لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ کس زمانے میں کس مُلک میں وہ رہتا تھا۔ خیر اب ہماری کہانی سُنیئے جس کا لفظ لفظ سچّا ہے۔

تھوڑے دنوں کا ذکر ہے صبح کا وقت تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ ہم اپنے اسکول کی لائبریری کی کتابیں اُلٹ پُلٹ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بارش کی وجہ سے مس بینرجی نے ہماری کلاس کو چھٹی دے دی اور کہا ۔۔ "جب بارش ذرا کم ہو تو گھر چلی جانا"۔

چنانچہ ہم لوگ لائبریری میں کتابیں ڈھونڈنے لگے تاکہ پڑھ کر وقت کاٹیں۔ ہاں تو ہم کتابیں چھانٹ کر

برآمدے کے پکے فرش پر آبیٹھے۔ کچھ لڑکیاں موسیقی کے کلاس روم کی طرف چلی گئیں۔ اور کچھ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگیں۔

میرے ہاتھ میں انگریزی کی الف لیلہ تھی پاس ہی کچھ اور کتابیں پڑی تھیں۔ میں اور سوشیلا برآمدے کی دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ سوشیلا کی نظریں سامنے والے آم کے درخت پر تھیں۔ شاید وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ بارش اور ہوا سے کتنے آم نیچے ٹپکے ہیں۔

میں نے کتاب بند کرکے کہا "سوشی۔ ہم ہمیشہ کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں کہ ایک بوّا درخت کے تنے میں سے باہر کُود آیا۔ ایک سنہری بطخ بھاگی۔ پریاں چاندنی کرنوں کی سیڑھی پر سے اُتر آئیں اور یا اور وہ ہمیں خود بھی اسی قسم کی چیز نظر آجاتی تو کتنا مزا ہوتا۔ ہیں نا؟"

سوشیلا نے جواب دیا "ایسا ہو کیوں نہیں سکتا مگر... مگر ہمیں ایک پَر والے گھوڑے کی ضرورت ہے تاکہ اس پر بیٹھ کر ہم کہانیوں کی بستی کی سیر کریں۔"

یہ سُن کر مجھے ایک دم کچھ یاد آگیا۔ میں نے کہا "ہاں۔ پھر جنگل میں ہمیں ایک جادوگرنی ملے گی۔ جس کی جھونپڑی چلتی پھرتی نظر آئے گی۔"

سوشیلا بولی "اور ایک بادشاہ ہوگا۔ اس کی لڑکی کو ایک دیو نے کہیں قید کر رکھا ہوگا۔ پھر ہم سنہرے پرندے کی مدد سے اس کو چھڑا لائیں گے۔" میں نے کہا "لیکن شہزادیوں کو دیو کی قید سے چھڑانے کے لیے تو شہزادے جاتے ہی ہیں جنھوں نے چودہ برس سورج کو نہ دیکھا ہو یا جنگل میں شکار کھیلتے کھیلتے راستہ بھول گئے ہوں۔ ہم شہزادے تھوڑی ہیں۔"

ہم دونوں پھر الف لیلہ پڑھنے لگے۔ بارش اور زیادہ تیز ہوگئی۔ موسیقی کے کلاس روم میں سے رضیہ اور رمیش کے گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سارے اسکول پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آٹھویں کلاس کے پیچھے جو باغ ہے وہاں سے لڑکیوں کے ہنسنے کی مدھم آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔

میں نے کہا "شاید مسز وائٹ نہیں ہیں جب ہی تو لڑکیاں پانی میں بھیگ کر آم چُن رہی ہیں۔"

ہم پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔

یکایک مجھے ایک آواز نے چونکا دیا۔ جو کہیں دُور سے آرہی تھی۔ جیسے چاندی کی ننھی ننھی سی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ وہ آواز کہہ رہی تھی "سوشیلا دیوی سوشیلا دیوی"! سوشی نے حیران ہوکر پوچھا "کون ہے؟ کیا مس فرینک ہیں"؟

میں نے جواب دیا "کہیں یہ پرستان کی آواز تو نہیں؟"

سوشی کہنے لگی "کیا پتہ کوئی آٹھ فٹ کا لمبی داڑھی والا بونا۔ شاہ بلوط کے تنے میں سے ہم کو پکار رہا ہے۔"

میں عقل مندی سے سر ہلا کر بولی "ہو سکتا ہے۔"

سوشی کہنے لگی "دیکھو شاید باغ میں جادو کا گھوڑا آ گیا ہو اور ہم سچ مچ پرستان میں پہنچ جائیں۔" اور ہم دونوں باغ میں اُتر گئے۔

اب میں آپ کو یہ تو بتانا نہیں چاہتی کہ وہاں "جادو کا گھوڑا" تھا یا نہیں کیونکہ آپ ضرور ہنسیں گے مگر نہ معلوم کس طرح ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جو ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ پرستان سمجھ لیجئے آپ۔ یا وہ ملک جہاں کہانیاں بنائی جاتی ہیں۔

پھر ہم نے اپنے آپ کو ایک بڑے سے ہال میں پایا میں نے اُسے غور سے دیکھا کہ کہیں یہ ہمارے اسکول کا اسمبلی ہال تو نہیں۔ مگر صاحب وہاں تو پریاں بیٹھی تھیں پریاں! میں نے بچپن سے لے کر اب تک کہانیوں میں جن کے متعلق سُنا تھا وہ سب اس ہال میں موجود تھے۔ بادشاہ کا عقل مند بوڑھا وزیر۔ اسنو وائٹ سنڈریلا جادوگرنیاں، خرگوش دربان، سپاہی۔ شہزادے۔ سونے کا انڈا دینے والی مرغیاں، جادو کا رُوپہلے پروں والا ہنس۔ کہاں تک گناؤں۔ وہاں کون کون تھا۔

ابھی میں سب کو اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ اسکول کے گھنٹے بجنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے جلدی سے سوشیلا کو بلایا۔ جو مزے سے بیٹھی اسنو وائٹ سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے کہا "سوشیلا۔ بھاگو جلدی سے اسکول میں چھٹی ہو گئی اب تک سب لڑکیاں بس میں بیٹھ چکی ہوں گی۔"

ہم دونوں نے سر پر پیر رکھ کر بھاگنا شروع کیا۔ راستے میں مجھے ایک خرگوش نظر آیا۔ جو کوٹ پتلون پہنے عینک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک لومڑی ہاتھ میں دستی پنکھا لیے بیٹھی تھی جائے پی رہی تھی۔ میں نے پرستان کی ایک نشانی ساتھ لے جانے کی غرض سے اُس کی پنکھیا چھین لی اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔

اسکول کے باغ میں داخل ہو کر ہم برساتی کی طرف گئے جہاں لڑکیاں موٹر بسوں میں سوار ہو رہی تھیں۔

جب میں اپنی موٹر میں بیٹھ چکی تو مجھے لومڑی کی جاپانی پنکھیا کا خیال آیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ پنکھیا مسز وائٹ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسکول کے برآمدے میں کھڑی اُسے ہلا ہلا کر مس فرینک سے باتیں کر رہی ہیں۔

میں اب تک حیران ہوں کہ پرستان کی لومڑی کی وہ زرد جاپانی پنکھیا مسز وائٹ کے ہاتھوں میں کیوں کر پہنچ گئی۔

عارف انجم صدیقی

میں تاریکیوں کو منوّر کروں گا

زمانے سے تنہا میں لڑتا رہوں گا
مصائب کی ہرگز نہ پروا کروں گا
بھلائی کو دنیا میں رائج کروں گا
بُرائی کو سر میں اُٹھانے نہ دوں گا

میں تاریکیوں کو منوّر کروں گا
وطن دشمنوں سے جہنّم بھروں گا
خدا کے سوا نہ کسی سے ڈروں گا
وطن میں میں اسلام رائج کروں گا

حوادث سے گھبرانے والا نہیں میں
مصائب سے ڈر جانے والا نہیں میں
غلط راہ پر جانے والا نہیں میں
صداقت سے شرمانے والا نہیں میں

میرا عزم راسخ میرا راہ برحق
کسی راہ زن کا نہ اب مجھ کو ڈر ہے
سبھی کی دُعاؤں کا مجھ پہ اثر ہے
چُنا میں نے یوں راہِ حق کا سفر ہے

میری راہ میں کوئی شیطان آئے
سرخ و سیاہ کوئی طوفان آئے
وہ فرعون و شدّاد و ہامان آئے
مدد میری کرنے کو رحمٰن آئے

دلوں میں خدا نورِ ایمان بھر دے
سبھی مشکلیں میری آسان کر دے

کوڑے دان

کلیم چغتائی

سعید صاحب نے گھڑی دیکھی اور گھبرا کر چائے کی پیالی سے آخری گھونٹ لیا۔ بریف کیس اُٹھایا' اپنے چھوٹے بچے کو پیار کیا جو ان کی ٹانگوں سے لپٹنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا پھر وہ پکار کر اپنی بیوی سے بولے "اچھا بھئی، ہم چلے" سعید صاحب کی بیوی نے باورچی خانے سے جھانک کر انہیں خدا حافظ کہا اور سعید صاحب بریف کیس سنبھال کر تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے اپنے فلیٹ سے باہر نکل آئے

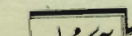

آج پھر انہیں دفتر جاتے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔

برابر والے فلیٹ کے مرزا صاحب کو دیکھ کر سعید صاحب نے خوش اخلاقی سے مسکرانے کی کوشش کی اسی وقت اوپر سے پیاز کے چھلکے، خربوزے کی گلی سڑی قاشیں اور اسی قسم کی کچھ اشیاء سعید صاحب پر آ کر گریں۔ خربوزے کی آدھی قاش سعید صاحب کی مونچھوں میں اٹک گئی، پیاز کے کچھ چھلکے اُن کے سر پر جم گئے اور ساتھ ہی اوپر سے پھینکے جانے والے گندے پانی نے سعید صاحب کی سفید بے داغ قمیض پر عجیب و غریب نقش و نگار بنا دیئے۔

اپنے کپڑوں کا یہ حشر دیکھ کر سعید صاحب مسکرانا بھول گئے اور دانت پیستے ہوئے اُوپر کی جانب دیکھنے لگے جہاں سے خربوزے کی قاشوں اور پیاز کے چھلکوں کا تحفہ آیا تھا۔ مرزا صاحب، سعید صاحب کی حالت دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے لیکن ہمدردی جتانے کو، اوپر کے فلیٹ والوں کی برائیاں کرنے لگے۔

"بس جی کیا بتایا جائے ایسا زمانہ آ گیا ہے، لوگ دن دیکھتے ہیں نہ رات، بس گیلری سے ہاتھ بڑھا کر دھڑ سے کچرا نیچے پھینک دیا۔ ارے بھئی نیچے سے کوئی گذر رہا ہو۔ کوئی کھڑا ہو..... حالانکہ مرزا صاحب کے بچے بھی روزانہ دن میں کئی بار اسی طرح ہاتھ بڑھا کر کچرا دروازے سے باہر اُچھال دیا کرتے تھے سعید صاحب چند لمحے تک وہیں کھڑے بے بسی سے اُوپر دیکھتے رہے پھر لمبے لمبے قدم بڑھاتے ہوئے واپس اپنے فلیٹ میں چلے گئے۔ انہیں اُمید نہیں تھی کہ وہ آج دفتر جا سکیں گے۔

پاکیزہ اسکوائر میں کُل چالیس فلیٹ تھے۔ ہر منزل پر دس فلیٹ! درمیان میں ایک احاطہ سا تھا جس کا فرش سیمنٹ کا تھا۔ کہنے کو یہ پاکیزہ اسکوائر تھا لیکن یہاں کے رہنے والے شاید پاکیزہ رہنا پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ عمارت کے احاطے میں جگہ جگہ سبزیوں پھلوں کے چھلکے، پُرانے جوتے ٹوٹی ہوئی بوتلیں پھٹے ہوئے کاغذ اور پتہ نہیں کیا کیا الّم غلّم بکھرا ہوا نظر آتا۔ روزانہ صبح جمعدار آ کر جھاڑو دیتا لیکن اِدھر وہ جھاڑو دے کر رخصت ہوا اُدھر تیسری منزل پر رہنے والے اشتیاق صاحب کی بیوی، گھر کی صفائی کر کے کوڑا گیلری سے نیچے لُڑھکا دیتیں، اِدھر چوتھی منزل پر مقیم عزیز صاحب کے فلیٹ کی کھڑکی کھُلتی اور عزیز صاحب کی پالتو بکری کی مینگنیاں ہوا میں تیرتی ہوئی پاکیزہ اسکوائر کے دامن پر بکھر جاتیں دوسری منزل پر رہنے والے احسان صاحب کے بچے بھلا کیوں پیچھے رہتے۔ وہ

اپنے گملوں میں پانی کا پائپ لگا کر بھول جاتے اور پانی گیدری کے پرنالے سے موٹی سی دھار کی صورت میں بہتا ہوا نیچے سے گزرنے والوں کو مفت میں نہلاتا رہتا۔ پھر تو سارے ہی فلیٹ والے اس "نیک کام" میں تعاون کرنے کی غرض سے اپنے اپنے گھر کا کچرا عمارت کے احاطے میں پھینک کر مطمئن ہو جاتے۔

شام ہوتی تو پاکیزہ اسکوائر کے لڑکے احاطے میں جمع ہو جاتے کوئی جھاڑو اُٹھا لاتا اِدھر اُدھر بکھرا ہوا کچرا جھاڑو کی مدد سے ایک طرف کر دیا جاتا اور پھر کرکٹ میچ شروع ہو جاتا۔ کرکٹ کھیلنے والوں کی اس ٹیم کا کپتان انور تھا انور نے ممبدار سے کئی مرتبہ کہا کہ کچرا بہت پھیلا رہتا ہے اس کا کوئی علاج کرو" مگر ممبدار ناراض ہو کر کہتا۔

"صاحب جی" میں نے اس بلڈنگ کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا صبح صبح صفائی ہو جاتی ہے اب لوگ کچرا پتہ نہیں کہاں سے لاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے پاس کچرا بنانے کی مشین لگی ہوئی ہے۔" اور انور یہ سن کر سر جھکا کر ایک طرف کو ہو لیتا۔

ایک ہفتے بعد انور کی کرکٹ ٹیم "شاہین کرکٹ کلب" کی پہلی سالگرہ تھی گزشتہ سال ہی تو انہوں نے اپنا کرکٹ کلب قائم کیا تھا انور اور اس کے ساتھی چاہتے تھے کہ اپنے پیارے کرکٹ کلب کی پہلی سالگرہ دھوم دھام سے منائیں۔ یوں بھی ان دنوں اسکولوں کی چھٹیاں تھیں۔ بس پھر کیا تھا انور صاحب نے جھٹ پٹ پڑوس کے ذیشان پلازہ کے "نور کرکٹ کلب" سے ایک روزہ میچ بھی رکھ لیا۔

شام کو پریکٹس کے لئے شاہین کرکٹ کلب کے ارکان جمع ہوئے تو انور نے اپنے ساتھیوں سے کہا بھئی سالگرہ تو منائی جا رہی ہے میرا خیال ہے کہ کسی اہم شخصیت کو انعامات دینے کے لئے بلایا جائے۔

"ضرور" "بالکل" "میں بھی یہی کہنے والا تھا۔" اسی قسم کی آوازیں آئیں۔

"مگر کون۔؟"

"میں بتاتا ہوں" سجاد کہنے لگا۔ "چوہدری اقبال کو بُلا لیں۔"

"کون چوہدری اقبال؟" انور نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

"ارے یار وہی ڈیری ایسوسی ایشن کے پتہ نہیں چیئرمین یا جنرل سیکریٹری قسم کی کوئی چیز ہیں۔"

"نہیں بھئی۔ کوئی ایسی شخصیت بتاؤ جسے کھیلوں سے دلچسپی ہو۔"

تو پھر نصیر الدین صاحب کو بلا لیتے ہیں" شہباز نے جلدی سے کہا "وہ کرکٹ کے کوچ رہ چکے ہیں اور اب بھی نوجوانوں کے میچ کروانے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ہمیں بھی کچھ اچھے مشورے دے سکیں"

میرا خیال ہے شہباز کا مشورہ درست ہے" انور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں آج رات جا کر نصیر صاحب سے بات کروں گا۔"

رات ہوئی تو عشاء کی نماز کے بعد انور، نصیر الدین صاحب کے گھر پہنچ گیا جو پاکیزہ اسکوائر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ انور نے نصیر صاحب کے گھر کے دروازے پر لگا گھنٹی کا بٹن دبایا تو نصیر صاحب کے شاندار مکان کے اندر دور کہیں کسی چڑیا کے چہچہانے کی آواز آئی پھر خاموشی چھا گئی۔ انور نے کچھ انتظار کے بعد گھنٹی کا بٹن دوبارہ دبانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازے میں سے آواز آئی۔

"جی کون صاحب ہیں؟"

انور اُچھل پڑا، اس لئے کہ آواز کسی خاتون کی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے کسی اسپیکر سے آئی ہو۔ اس نے گلا صاف کر کے کہا۔ "جی میرا نام انور ہے۔"

"کس سے ملنا ہے انور صاحب؟" دروازے نے پوچھا!

"مجھے نصیر الدین صاحب سے ملنا ہے" انور نے دروازے سے کہا۔

"اچھا ٹھہریئے۔ نصیر صاحب نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے، اگر آ گئے ہوں تو بھیجتی ہوں"

دروازے نے خاتون کی آواز میں جواب دیا۔ اس وقت انور کی سمجھ میں آیا کہ دروازے میں انٹر کام لگا ہوا تھا اس آلے کی مدد سے گھر کے اندر موجود کوئی بھی فرد، باہر کھڑے ہوئے شخص سے بات چیت کر سکتا ہے۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور نصیر الدین صاحب باہر آ گئے۔ انہوں نے سبز رنگ کی شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم! فرمایئے۔! مجھے نصیر الدین کہتے ہیں" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"السلام علیکم! جی میں آپ کو جانتا ہوں" انور نے جلدی سے کہا۔ "دراصل میں یہاں سے کچھ دور پاکیزہ اسکوائر میں رہتا ہوں۔ ہم نے ایک کرکٹ ٹیم شاہین کرکٹ کلب کے نام سے بنا رکھی ہے۔ اب ہمارا یہ کلب ایک سال کا ہو جائے گا۔ ہم نے اس موقع پر....."

"ارے ارے ارے!" نصیر صاحب نے انور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ "ساری باتیں ایک نشست میں اور وہ بھی کھڑے کھڑے۔ اندر بیٹھتے ہیں پھر بات ہوگی۔" وہ انور کا ہاتھ تھام کر اندر لے گئے سامنے ہی ان کا ڈرائنگ روم تھا۔ انور کو صوفہ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ خود بھی سامنے ایک صوفہ پر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی انہوں نے زور سے آواز دی۔ "انور....."

"جی؟!!" انور ان کے اس طرح پکارنے پر گڑبڑا سا گیا۔

"اوہ! مجھے خیال ہی نہیں تھا کہ تمہارا نام بھی انور ہے۔" نصیر صاحب اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولے۔ انور دراصل ہمارے ملازم کا نام بھی ہے۔"

"جی صاحب" نصیر صاحب کا ملازم انور، ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔

"بھئی کچھ چائے وغیرہ لاؤ۔" نصیر صاحب بولے۔

"جی اچھا" انور یہ سنتے ہی فوراً اندر غائب ہوگیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں نصیر صاحب" انور نے جلدی سے کہا میں گھر سے کھانا کھا کر آیا ہوں"

"بھئی پھر تو چائے ضروری ہے۔" نصیر صاحب مسکرا کر بولے۔ "ہاں جی۔! تو آپ کا ننھا منا کلب اب سال بھر کا ہونے والا ہے۔" انہوں نے اپنے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"جی!" انور نے کہا "اور ہم اس موقع پر آپ کو ایک زحمت دینا چاہ رہے ہیں۔"

"کیسی زحمت"

ہم نے اس موقع پر ذیشان پلازہ کے نور کرکٹ کلب سے ایک روزہ میچ رکھا ہے ہماری خواہش ہے کہ میچ کے اختتام پر انعامات آپ تقسیم کریں۔"

بھئی میں تو کوئی بڑا آدمی نہیں ہوں" نصیر صاحب ہنسنے لگے۔ اسی وقت ان کا ملازم ٹرے میں چائے پھل اور کچھ بسکٹ سجا کر لے آیا۔

"لو بھئی انور میاں۔" نصیر صاحب نے ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ان کا ملازم "انور میاں" کہے جانے پر چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا پھر اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ نصیر صاحب مہمان سے بات کر رہے ہیں۔ وہ ٹرے رکھ کر اندر چلا گیا۔

ملازم کے جاتے ہی انور نے بات پھر چھیڑی۔

"نصیر صاحب آپ کرکٹ کے کوچ رہے ہیں، ہم اس لئے آپ کو بلانا چاہتے ہیں تاکہ آپ ہمیں کچھ

مفید مشورے دے سکیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہماری ٹیموں کا کچھ دیر کھیل بھی دیکھیں۔"

"ہوں!" نصیر صاحب سوچتے ہوئے بولے۔ "یہ تو ٹھیک ہے کہ میں نے بیس سال کرکٹ ٹیموں کو تربیت دی ہے۔ اب تو سر کے بال سفید ہو گئے۔ لیکن بھئی میرا ایک اصول ہے۔"

"وہ کیا؟" انور نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"میرا اصول یہ ہے کہ میں اب صرف انہی کرکٹ ٹیموں کے پروگراموں میں شرکت کرتا ہوں جن کے کم از کم آدھے کھلاڑی نماز کے پابند ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے" انور خوش ہو کر بولا۔ "ہماری ٹیم کے تو سارے کھلاڑی نماز باجماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں ... مگر ....." انور کہتے کہتے رُک گیا اور اس کا چہرہ پریشان سا ہو گیا۔

"مگر کیا؟" نصیر صاحب نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ذیشان پلازہ کے لڑکے نماز نہیں پڑھتے۔" انور نے اداس ہو کر کہا۔

"ارے تم تو اُداس ہو گئے" نصیر صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے قریب آ گئے "بھئی تمہاری ٹیم کے لڑکے تو نماز پڑھتے ہیں نا؟ اور سالگرہ بھی تمہارے کلب کی ہے۔ چلو اب خوش ہو جاؤ۔ میں تمہاری تقریب میں ضرور آؤں گا۔ انشاءاللہ۔"

انور کا چہرہ کِھل اٹھا "تقسیم انعامات کی تقریب نماز عصر کے بعد ہو گی یعنی تقریباً سوا چھ بجے، پاکیزہ اسکوائر میں۔"

"ٹھیک ہے، میں اسے نوٹ کئے لیتا ہوں" نصیر صاحب اُٹھ کر اپنی ڈائری اور قلم نکالنے لگے "اور بھئی یہ تو لو ..... چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" انہوں نے میز پر رکھی ٹرے کی طرف اشارہ کیا اور انور نے ہاتھ بڑھا کر ایک بسکٹ اٹھا لیا۔

انور کی ٹیم کے لڑکوں نے ایک رات پہلے ہی خوب محنت کر کے، پاکیزہ اسکوائر کے احاطے کی اچھی طرح صفائی کر دی تھی۔ صبح ہونے پر حسبِ معمول کچرا پھینکا جانے لگا تو شاہین کرکٹ کلب کے کھلاڑیوں نے پھر جھاڑو سنبھال کر کچرا اٹھانے میں جمعدار کی مدد کی۔ آٹھ بجے کے قریب دونوں ٹیموں کے ارکان سفید لباس پہنے میدان میں اتر چکے تھے۔ دونوں ٹیموں کے کپتانوں نے ٹاس کیا۔ ٹاس نور کرکٹ کلب نے جیتا اور اس کے کپتان شاکر نے شاہین کرکٹ کلب کو بیٹنگ کی دعوت دی۔

یہ محدود اوورز کا میچ تھا۔ خاصا دلچسپ رہا۔ میچ کے دو امپائر تھے ایک پاکیزہ اسکوائر سے دوسرے ذیشان پلازہ سے ان کے علاوہ فریقین کی مرضی سے دو منصفین بھی مقرر کئے گئے تھے۔

ساڑھے بارہ بجے تک شاہین کرکٹ کلب کی ٹیم ۱۸۴ رنز بنا کر آؤٹ ہو چکی تھی۔ پھر کھانے اور نماز کا وقفہ ہو گیا۔ ڈھائی بجے میچ دوبارہ شروع ہوا۔ اب نور کرکٹ کلب کی باری تھی۔ شاہین کرکٹ کلب میں دو تین بالر بہت اچھے تھے۔ میچ شروع ہوتے ہی نور کرکٹ کلب کے تین کھلاڑی چھ سات رنز بنا کر آؤٹ ہو گئے۔ جب نور کرکٹ کلب کی پانچویں وکٹ گری تو ایک سفید کار پاکیزہ اسکوائر کے احاطے میں آ کر رکی اور اس میں سے نصیر الدین صاحب اُترے۔ انور نے میچ میں دو منٹ کا وقفہ کروایا۔

مہمانِ خصوصی کا استقبال کیا اور ایک جانب رکھے صوفہ پر تشریف رکھنے کی درخواست کی۔ نصیر صاحب بیٹھ گئے تو میچ دوبارہ شروع ہوا۔ نور کرکٹ کلب کے کھلاڑی دباؤ میں آ چکے تھے ان کا صرف ایک کھلاڑی شفقت ۵۶ رنز بنانے میں کامیاب ہوا اور ساری ٹیم ۱۰۲ رنز کے اسکور پر آؤٹ ہو گئی۔ اس طرح شاہین کرکٹ کلب نے یہ میچ ۸۲ رنز سے جیت لیا۔

یہ میچ ختم ہوا تو منصفین کے فیصلے کے مطابق شاہین کرکٹ کلب کے فیروز کو مین آف دی میچ قرار دیا گیا جس نے صرف ۲۰ رنز دے کر پانچ وکٹیں لی تھیں۔

نماز عصر کا وقفہ دیا گیا۔ شاہین کرکٹ کلب کے تمام کھلاڑیوں نے پاکیزہ اسکوائر کی مسجد میں نماز پڑھی نور کرکٹ کلب کے کھلاڑی اس دوران اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے۔ نماز کے بعد سارے کھلاڑی پھر جمع ہوئے۔ نصیر صاحب نے ایک مختصر سی تقریر کی انہوں نے کہا۔

"بچو! مجھے خوشی ہے کہ آپ اتنی چھوٹی عمر میں اس قدر عمدہ کھیل پیش کر رہے ہیں۔ اگر آپ تھوڑی سی توجہ دیں تو آپ ایک دن ٹیسٹ کرکٹ کے کھلاڑی بن سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی پڑھائی پر بھی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ توجہ دیتے ہوں گے۔ بہرحال جیتنے والی ٹیم اور نہ جیتنے والی ٹیم دونوں کو میری طرف سے مبارک باد، مجھے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی ہے کہ شاہین کرکٹ کلب کے کھلاڑی نماز جیسے اہم ترین فرض کی بھی پابندی کرتے ہیں۔ اس کلب کی آج پہلی سالگرہ ہے"۔۔۔۔

"اس خوشی کے موقع پر اپنی جانب سے اس کلب کو پانچ سو روپے پیش کرتا ہوں۔" انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چیک نکالا اور انور کو بلا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر وہ بولے۔ "نور کرکٹ کلب سے میرا وعدہ ہے کہ جب ان کے کھلاڑی نماز کی پابندی کرنے لگیں گے انہیں بھی کچھ نہ کچھ ضرور پیش کروں

گا۔ اچھا۔" انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر اپنی گھڑی دیکھی "اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"ٹھہریئے جناب۔" انور نے کھڑے ہو کر کہا۔ اور شاہین کرکٹ کلب کے ارکان، ٹھنڈی بوتلوں کے کریٹ اٹھا کر لے آئے۔"

بوتلیں پی کر سب لوگ رخصت ہونے لگے۔ نصیر صاحب اپنی سفید کار کی طرف بڑھے اسی وقت اوپر کے کسی فلیٹ سے کسی نے برتن دھو کر گندا پانی نیچے بہا دیا۔ نصیر صاحب کی سفید کار پر گندا پانی یوں پھیل گیا جیسے کسی ملک کا نقشہ ہو!

انور اور اس کے ساتھیوں کا غصہ اور شرمندگی سے بُرا حال تھا۔ ایک لڑکا بھاگ کر اپنے گھر گیا اور کپڑا لا کر نصیر صاحب کی کار صاف کر دی۔

"مجھے بے حد..... بہت..... افسوس ہے...." انور نے بڑی مشکل سے کہا۔

کوئی بات نہیں بچو!" نصیر صاحب نرمی سے بولے....." ایسا اکثر جگہوں پر ہوتا ہے۔ اب یہ تم نوجوانوں کا کام ہے کہ اس خرابی کو دُور کرو۔ اچھا بھئی اب میں جاتا ہوں۔ تم لوگوں کے ساتھ اچھا وقت گذرا۔"

اسی وقت مسجد سے مغرب کی اذان ہونے لگی۔

رات کو عشاء کی نماز کے بعد انور کے فلیٹ کے چھوٹے کمرے میں ٹیم کے سارے کھلاڑی جمع تھے "یار آج اس گندے پانی نے مزا کرکرا کر دیا۔ ورنہ اس قدر خوشی ہو رہی تھی۔" فیروز نے کہا جسے مین آف دی میچ کا ایوارڈ ملا تھا۔

"واقعی تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ شہباز نے ہاں میں ہاں ملائی۔" اور لوز کرکٹ کلب والوں کو دیکھا تھا، کیسا مُنہ بنا کر جا رہے تھے۔"

"خیر خیر۔ ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔ مُنہ بنانے کی کیا بات ہے۔" انور نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ "میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ ہمارے کلب کو نصیر صاحب نے جو پانچ سو روپے دیئے ہیں ان کو کیسے استعمال کیا جائے گا۔"

میں بتاؤں؟ نسیم جلدی سے بولا۔ "ٹیم کے لیئے نئے بیٹ اور نئے پیڈ خریدے جائیں۔"

"ہاں، ہاں، ٹھیک ہے۔" کئی لڑکے بولے۔

"میرا بیٹ پرانا ہو گیا۔" یعقوب نے کہا۔

مگر میں کچھ اور سوچ رہا ہوں" انور نے کہا۔

وہ کیا.....؟

انور نے اپنے ساتھیوں کو اپنے منصوبہ کے بارے میں بتایا۔ تھوڑی سی بحث کے بعد اس کے تمام ساتھی اس کے منصوبہ کی تعریف کر رہے تھے۔

دو روز بعد، پاکیزہ اسکوائر میں رہنے والے صبح کو اٹھے تو انہوں نے ہر فلیٹ کے دروازے کے قریب پلاسٹک کی ایک رنگین خوبصورت ٹوکری رکھی دیکھی ہر دروازے پر ایک خط کی فوٹو اسٹیٹ نقل لگی ہوئی تھی خط میں لکھا تھا۔

"شاہین کرکٹ کلب کی جانب سے آپ کے لئے ایک پُرخلوص تحفہ"۔ سابق کوچ نصیر الدین صاحب نے شاہین کرکٹ کلب کی سالگرہ کے موقع پر کلب کو پانچ سو روپے کا عطیہ دیا تھا۔ شاہین کرکٹ کلب کے ارکان نے یہ رقم کلب پر خرچ کرنے کی بجائے آپ کے لئے کوڑے کی ٹوکریاں خرید نے پر صرف کر دی ہے۔ براہ کرم اپنے فلیٹ کا تمام کوڑا پھینکنے کی بجائے اس ٹوکری میں ڈالیئے۔ اس طرح ہمارا پاکیزہ اسکوائر سچ مچ پاکیزہ اسکوائر بن جائے گا۔ اور کسی کو تکلیف نہ ہوگی۔

شام کو شاہین کرکٹ کلب کے کھلاڑی جب پریکٹس کرنے کے لئے پاکیزہ اسکوائر کے احاطے میں جمع ہوئے تو احاطے میں کچرے کا نام و نشان تک نہ تھا۔

شیشہ توڑو، انعام لو

انگلستان کے ایک کلب کرکٹر برائن یم بروک نے چائے خانے کی کھڑکی توڑ کر ۲۰۰ سال پرانا ریکارڈ توڑ دیا۔ اور ۵۰ پونڈ کا انعام حاصل کیا۔ روایت ہے کہ ۱۷۷۶ء میں کینٹ کے میوفم کلب کے مالک نے اعلان کیا تھا کہ جو کرکٹر چھکا مار کر پہلی بار چائے خانے کی کھڑکی کا شیشہ توڑے گا اسے ۵۰ پونڈ بطور انعام دیے جائیں گے۔ میوفم کلب کے برائن نے ایک میچ میں چھکا مار کر شیشہ توڑ دیا اور ۵۰ پونڈ کا انعام حاصل کر لیا۔ اس چھکے کے نتیجے میں برائن کا کلب یہ میچ بھی جیت گیا۔

گلہری کی دنیا

مشہود شہزاد

آپ میں سے اکثر نے بھری دوپہر میں اپنے باغیچے یا گلی میں موجود درختوں کے آس پاس چِک چِک... چِک چِک چِک چِک کی باریک سی آوازیں نکالتی ہوئی گلہریوں کو ضرور دیکھا ہوگا۔ جو غذا کی تلاش میں درختوں سے اُتر کر ادھر اُدھر اُچھلتی پھرتی ہیں۔ ان گلہریوں کی کمر پہ دھاریاں سی ہوتی ہیں جنھیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کسی انسان نے اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو مٹیالے رنگ میں بھگو کر پیار سے اُن کی کمر پہ پھیر دیا ہو۔ یہ گلہریاں درختوں پر رہتی ہیں، لیکن امریکہ میں کثرت کے ساتھ ایسی گلہریاں پائی جاتی ہیں جو درختوں کے بجائے زمین میں بِل بنا کر رہتی ہیں۔ ان گلہریوں کی کمر پہ ہمارے مُلک میں پائی جانے والی گلہریوں کی طرح دھاریاں نہیں ہوتیں۔

امریکہ کے اریزونا نام کے صحرا میں ایسی گلہریاں عام پائی جاتی ہیں۔ یہ گلہریاں سورج نکلتے ہی اپنے بلوں سے غذا کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ مادہ گلہری سب سے پہلے بل سے باہر آتی ہے اور پھر اُس کے بچّے۔ نصف دن گزر جانے کے بعد یہ گلہریاں کسی ایسی زمین دوز جگہ پر آرام کرتی ہیں جہاں وہ گرمی کی شدّت سے محفوظ رہ سکیں۔ جوں ہی گرمی کی شدّت میں کمی واقع ہوتی ہے یہ گلہریاں ایک بار پھر اپنے بچّوں کو لے کر جن کی عمریں عام طور پر پانچ ہفتوں سے زیادہ نہیں ہوتیں غذا کی تلاش میں زمین دوز جگہوں سے باہر آجاتی ہیں، چھوٹے پودے، اور کیڑے مکوڑے ان گلہریوں کی مرغوب غذا ہیں۔

گلہریوں کے بچّے جب تھوڑے بڑے ہوتے ہیں تو وہ اپنی غذا خود تلاش کرتے ہیں اور جس وقت وہ اپنی غذا کھانے میں مصروف ہوتے ہیں تو مادہ گلہری اُن کی چوکیداری کرتی ہے اور جوں ہی اُسے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے وہ اپنے منہ سے تیز سیٹی کی سی آواز نکالتی ہے اور اُس کے بچّے دوڑ کر اپنے بلوں میں گھُس جاتے ہیں۔

دس ہفتوں کی عمر کو پہنچ کر گلہری کے بچّے اپنے خاندان سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ گلہری کے مادہ بچّے اپنے گھر اپنی ماں کے بل کے قریب ہی بناتے ہیں جبکہ نر بچّے عام طور پر دوسری جگہوں پہ جا کر رہنے لگتے ہیں۔ زیرِ زمین رہنے والی یہ گلہریاں عام طور پر کنگارووں، چوہوں یا دیگر جانوروں کے چھوڑے ہوئے بلوں میں رہتی ہیں البتہ کچھ گلہریاں خود اپنے بل کھود کر ان میں رہتی ہیں۔

گلہریاں اُس وقت تک اپنے بچّوں کو غذا مہیا کرتی رہتی ہیں جب تک صحرا میں غذا کی قلّت نہ ہو۔ سردیوں کا پورا موسم یہ گلہریاں اپنے بلوں میں گزارتی ہیں۔ اس پورے موسم میں یہ گلہریاں اپنے جسم میں جمع ہو جانے والی چکنائی پر گزارہ کرتی ہیں موسم بہار کے ابتدائی دنوں میں گلہریاں اپنے بچّوں کو بلوں کے اندر ہی غذا مہیا کرتی ہیں لیکن کچھ ہی ہفتوں کے بعد یہ گلہریاں اپنے بچّوں سمیت ایک مرتبہ پھر بلوں سے باہر آکر غذا تلاش کرنے لگتی ہیں۔

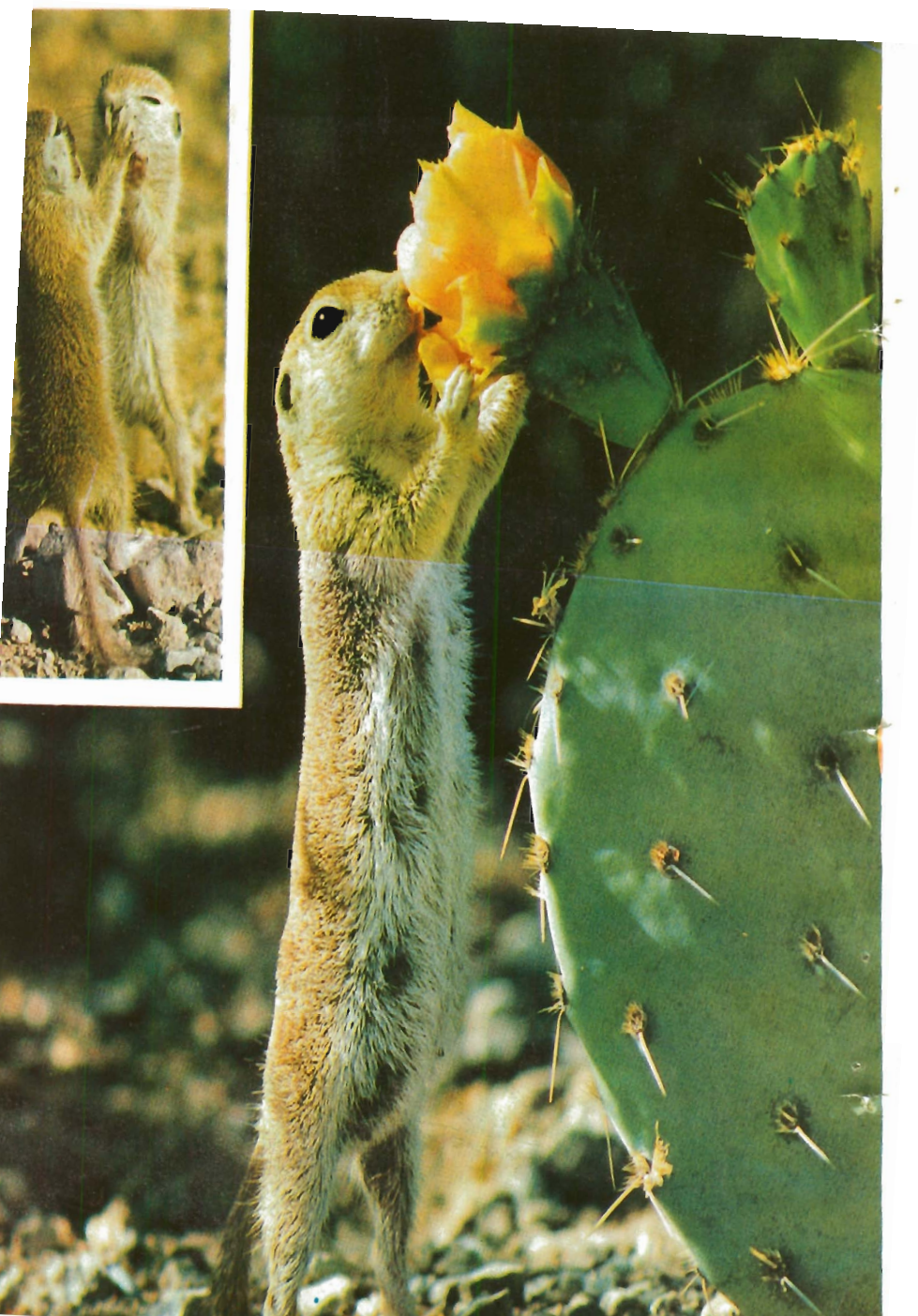

لذّت میں لاثانی ۔ پکانے میں آسانی!

احمد کھیر مکس

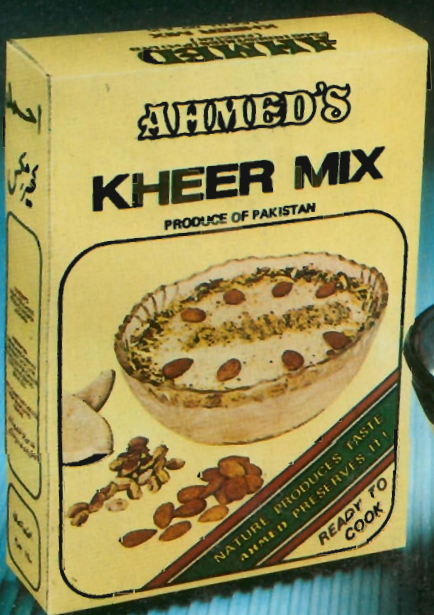

متوازن اور معیاری اجزاء
بہترین اور مثالی صفائی

احمد کا بین الاقوامی معیار آپ کے اعتماد کی ضمانت!

حق اسکواڈ
اخلاق احمد

مقابلہ

سرفراز، شہریار، ضیا اور شہزاد ۔۔۔ چاروں ان دنوں بہت خوش تھے۔ علاقے کے کئی لوگوں نے ان کے والدین کو مبارکباد دی تھی۔ کئی نے خود ان سے مل کر انھیں شاباش دی تھی۔ جب سے پہلوان دودھ والے کی دکان بند ہوئی تھی اور علاقے میں خالص دُودھ کی فراہمی شروع ہوئی تھی لوگ "حق اسکواڈ" کے ارکان کو محبت سے دیکھنے لگے تھے۔

ایک روز جب وہ معمول کے مطابق اپنے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے، سرفراز نے کہا۔۔۔ "میں تو بہت پریشان ہوں، آج کل"۔ ضیا نے حیرت سے پوچھا۔۔۔ "کیوں۔۔۔؟ کیا ہوا۔۔۔؟"

سرفراز بولا۔۔۔ "جب سے علاقے میں خالص دودھ فروخت ہونا شروع ہوا ہے، لوگ مجھے بہت احترام سے مخاطب کرنے لگے ہیں۔ بڑی عزت سے پیش آنے لگے ہیں۔۔۔"

شہزاد نے کہا۔۔۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔۔۔"

سرفراز بولا۔۔۔ "عجیب سا لگتا ہے۔ یعنی میرے امّی ابّو بھی مجھے پیار سے دیکھنے لگے ہیں۔ کبھی کبھی میں بازار سے گزرتا ہوں اور لوگ عجیب انداز سے مجھے غور سے دیکھتے ہیں تو میرا دل چاہتا ہے، اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھوں کہ کہیں سینگ تو نہیں نکل آئے ہیں۔۔۔!"

شہریار ہنسا۔۔۔ "سینگوں کی کیوں فکر کرتے ہو۔۔۔! دُم چیک کیا کرو۔۔۔!"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں یار..." سرفراز نے سر ہلا کر کہا۔ "سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں، یہ اچھی بات نہیں ہے۔ کہ لوگ ہمیں اس طرح دیکھیں۔ میرا خیال ہے کہ "حق اسکواڈ" کو ہر کام چھپ کر کرنا چاہیئے۔ ہر کارنامہ خاموشی سے سرانجام دینا چاہیئے۔ دیکھو نا، ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ شہرت کی خاطر، دوسروں سے تعریف کروانے کے لیے تو نہیں کرتے۔"

شہریار نے کہا۔ "دراصل آج تک کبھی ایسا ہوتا نہیں تھا کہ ہم نے لوگوں کا کوئی مسئلہ اس طرح حل کیا ہو۔ یہ تعریف، یہ محبت ہمیں اس لیے عجیب لگ رہی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں ہمیں اس سے گھبرانا یا بوکھلانا نہیں چاہیے۔ ہم یقیناً تعریف کے بھوکے نہیں ہیں لیکن اس تعریف کا ایک فائدہ ضرور ہے۔"

"کیا فائدہ ہے بھائی اس کا...؟" سرفراز نے کہا۔

"فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ ان ہی کے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں جو برائی کو ختم کرنا چاہتے ہیں اچھائی کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ برائی کے خلاف لڑنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ وہ ہمیں دیکھیں گے تو ان کے دل میں بھی نیکی کو فروغ دینے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ برائی کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی خواہش پیدا ہوگی۔ اس لیے میرے پیارے سرفراز، ایسی تعریف سے، ایسی شہرت سے گھبراؤ مت۔ پریشان نہ ہو۔"

ضیاء نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ سرفراز کی پریشانی ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔"

"وہ کیا...؟" شہزاد نے حیرت سے پوچھا۔

"چائے بنائی جائے..." ضیاء نے کہا۔ "گرما گرم، مزیدار چائے۔"

چاروں اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ اپنے خار نما ہیڈ کوارٹر کے ایک کونے سے انھوں نے چائے کے برتن نکالے۔ سرفراز نے کیتلی میں پانی بھر کر چولھا جلایا اور کیتلی چولھے پر رکھ دی۔ ذرا سی دیر بعد جب پانی اُبل گیا تو ضیاء نے اس میں پتی ڈال کر چائے بنائی۔ شہریار نے چینی کے مگوں میں چائے بنائی اور شہزاد نے ایک ایک مگ سب کے سامنے رکھ دیا۔

چائے پینے کے دوران ہی شہزاد نے کہا۔ "کئی دنوں سے میں ایک بات سب کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے، تم سب کے علم میں، لیکن ہر بار بات کرنا بھول جاتا ہوں..."

"کون سی بات...؟" سرفراز نے پوچھا۔ "کیا کوئی اُڑن طشتری تیار کر لی ہے...؟"

"نہیں۔" شہزاد نے کہا۔ "میں اسکول کے دو لڑکوں کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔"

شہریار، سرفراز اور ضیاء نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

شہزاد بولا۔ "تم لوگوں نے بھی انھیں دیکھا ہوگا۔ میں ساجد اور افتخار کی بات کر رہا ہوں..."

"ساجد اور افتخار...!" شہریار حیرت سے بولا۔

"وہی جو بہت امیر گھرانے کے لڑکے ہیں...؟" ضیاء نے پوچھا۔

"جو کالے چشمے پہن کر اسکول آتے ہیں...!" سرفراز نے کہا۔

"ہاں..." شہزاد نے کہا..."میں اُنھی ساجد اور افتخار کی بات کر رہا ہوں۔ وہ بہت امیر خاندان کے لڑکے ہیں' اس لیے وہ عام لڑکوں کو منہ نہیں لگاتے ہیں۔ کسی سے سیدھی طرح بات نہیں کرتے ہیں۔ اتنا غرور میں نے بہت کم لڑکوں میں دیکھا ہے۔"

سرفراز ہنسا..."گویا اب حق اسکواڈ لوگوں کے رویے ٹھیک کرے گا۔ اُنھیں تہذیب سکھائے گا۔ ان کے غرور کو کم کرے گا۔ یار کیسی احمقانہ باتیں کر رہے ہو...؟ ہمارا کام بُرائی کو ختم کرنا ہے۔ لوگوں کی فطرت بدلنا نہیں ہے..."

شہزاد نے کہا "پہلے پوری بات تو سُن لو۔ مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ یہ دونوں لڑکے اب اسکول کے باقاعدہ غنڈے بن چکے ہیں۔ یہ لڑکوں کو ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ کسی کی کاپی پھاڑ دیتے ہیں۔ کسی سے پیسے چھین لیتے ہیں' کسی کی کتابیں چرا لیتے ہیں..."

وہ تینوں حیرت سے منہ کھولے شہزاد کی بات سُن رہے تھے۔

شہزاد کہہ رہا تھا..."رفتہ رفتہ ان دونوں کی شہرت ہر کلاس میں پہنچ گئی ہے۔ لڑکے اب ساجد اور افتخار سے خوف کھانے لگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی نہیں چاہتا کہ اس کی کاپیاں گُم ہو جائیں یا اس کے پیسے چھین لیے جائیں یا اس کی ٹھکائی لگائی جائے۔ ایسے ہی خطرات کے پیشِ نظر کئی لڑکوں نے ساجد اور افتخار سے بہتر تعلقات قائم کر لیے ہیں۔ ان سے دوستی کر لی ہے۔ ایسے لڑکوں کی دوستی کے بڑے فائدے ہوتے ہیں۔ نہ کوئی ڈرا دھمکا سکتا ہے' نہ مار پیٹ کر سکتا ہے۔ اسکول کے کئی لڑکوں نے ساجد اور افتخار کی مدد سے اپنے کئی دشمنوں کو مار لگوائی ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ ساجد اور افتخار اب کئی لڑکوں سے باقاعدہ پیسے وصول کرتے ہیں۔ ان پیسوں کے عوض وہ ان کے لیے مار دھاڑ کے فرائض بھی سرانجام دیتے ہیں اور مخالفوں سے محفوظ بھی رکھتے ہیں' لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ جو لڑکا ایک بار انھیں پیسے دے دیتا ہے' اُسے پھر ہر ماہ پیسے دینے پڑتے ہیں۔ ایسے لڑکوں کی تعداد کافی ہے جو ساجد اور افتخار کے جال میں گرفتار ہیں۔ ایسے لڑکوں کو ہر ماہ انھیں پانچ روپے دینے پڑتے ہیں۔ کوئی کام کروانا ہو یا نہیں' پیسے بہرحال ضرور دینے پڑتے ہیں۔ سمجھ رہے ہو تم لوگ...؟"

شہریار نے سر ہلایا..."ہاں... میں سمجھ رہا ہوں..."

سرفراز نے کہا..."یہ... یہ تو غنڈہ ٹیکس ہے...!"

"کھلّم کھلّا بدمعاشی ہے..." ضیاء بولا۔

ایک لمحے کے لیے وہ چاروں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر شہر یار نے کہا۔۔ " آئیڈیا تو اچھا ہے ۔۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی تھی۔

سرفراز بولا۔۔" ایسے لڑکوں سے تو ہمیں ضرور نمٹنا چاہیئے۔ جو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مبتلا ہوں، جو کمزوروں کو قوت کے ذریعے دباتے ہوں۔ جو شریف لڑکوں کو بدمعاشی کے ذریعے جھکانے کی کوشش کرتے ہوں۔۔"

شہر یار نے کہا۔۔" تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ طاقت اچھی چیز ہے، مگر طاقت پر غرور کرنا ایک لعنت ہے۔ اس غرور کو، اس لعنت کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے ۔۔۔ کیوں حضرات، میں ٹھیک فرما رہا ہوں نا ۔۔۔؟"

وہ سب مسکرائے۔ ان کے چہرے آنے والے ایڈونچر کے خیال سے دمکنے لگے تھے۔

اگلے دن ہر روز کی طرح ساجد اور افتخار سیاہ چشمہ لگائے، قیمتی بستے ہلاتے، چیونگم چباتے اسکول پہنچے تو اسکول کے دروازے پر ہی ان کی ملاقات سرفراز سے ہوگئی۔

سرفراز منہ لٹکائے، اُداس کھڑا تھا۔

" کیا ہوگیا بیٹا ۔۔؟" ساجد نے بستہ زمین پر رکھ کر پوچھا۔۔" اُداس اُلو کی طرح کیوں بیٹھا ہے ۔۔۔؟"

" کچھ نہیں یار ۔۔" سرفراز نے مایوسی سے کہا۔۔" اپنی قسمت ہی خراب ہے ۔۔"

" قسمت کس چڑیا کا نام ہے ۔۔۔؟" افتخار اپنے بال سنوار کر ہنسا۔۔" کیا کسی سے پھڈا ہوگیا ہے ۔۔۔؟"

" پھڈا تو نہیں ہوا ۔۔" سرفراز بولا۔۔" لیکن مجھے دھمکی دی گئی ہے ۔۔"

ساجد اور افتخار نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرائے۔

ساجد نے اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور بولا" کس نے دی ہے بھئی دھمکی تجھے ۔۔! ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ اسکول میں ایسا کون سا رستم پیدا ہوگیا ہے ۔۔"

افتخار نے ایک بار پھر اپنے بال سنوارے اور کہا۔۔" پھر تجھے کون دھمکی دے سکتا ہے ۔۔۔؟ تُو تو ہر وقت اپنے ان تینوں دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔۔"

سرفراز نے پھر اُداسی سے سر ہلایا اور کہا۔۔" یہی تو مشکل ہے۔ مجھے انہی میں سے ایک نے دھمکی دی ہے۔ شہر یار نے۔ اُس نے کہا ہے کہ اگر کل شام تک میں نے اس سے سب کے سامنے معافی نہیں مانگی تو وہ میری ہڈیاں توڑ دے گا۔"

ساجد اور افتخار نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر مسکرائے۔

" یہ کیا بات ہوئی ۔۔۔؟" ساجد نے کہا۔۔" جھگڑا کس بات پر ہے ۔۔۔؟"

سرفراز بولا۔۔" بس یونہی کھیلتے کھیلتے جھگڑا ہوگیا تھا۔ میں نے اُسے دوستوں کے سامنے بُرا بھلا کہہ دیا تو اُس نے مجھے

مُکّا مارنے کی کوشش کی۔ دوستوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا، لیکن شہریار کہتا ہے کہ وہ بدلہ ضرور لے گا۔ اگر کل شام تک میں نے سب دوستوں کے سامنے اس سے معافی نہیں مانگی تو۔۔۔"

"تو وہ تمھاری ہڈّیاں توڑ دے گا۔۔۔" افتخار نے کہا۔۔۔ "اتنی گہری دوستی تھی تم لوگوں میں، اور اب وہ تمھیں دھمکیاں دے رہا ہے۔۔۔"

ساجد نے اپنا پیٹ سہلایا اور بولا۔۔۔ "کیا وہ واقعی تمھاری ٹھکائی لگا سکتا ہے۔۔۔؟"

سرفراز نے سر ہلایا۔۔۔ "ہاں، وہ قد میں مجھ سے دو انچ زیادہ ہے۔ تم دونوں کے برابر ہے۔ صحتمند بھی ہے۔۔۔"

ساجد نے اپنا سیاہ چشمہ اُتار کر کہا۔۔۔ "ہم تمھیں شہریار سے بچا سکتے ہیں۔۔۔"

"تم۔۔۔؟" سرفراز نے چونک کر سر اُٹھایا۔۔۔ "مگر۔۔۔ مگر کیسے۔۔۔؟"

"ہم کیا نہیں کر سکتے۔۔۔" افتخار نے غرور سے کہا۔۔۔ "ہم شہریار کی ہڈّیاں توڑ سکتے ہیں۔ اُسے مار مار کر اُلو بنا سکتے ہیں، اُسے تم سے معافی مانگنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔۔۔"

سرفراز کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔۔۔ "کیا۔۔۔ کیا واقعی تم یہ سب کر سکتے ہو۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔" ساجد نے کہا۔۔۔ "مگر دنیا میں کوئی کام مُفت نہیں ہوتا۔ ہم تمھاری مدد کرنے کے عوض پیسے لیں گے۔ پانچ روپے۔ ہمیں کل شام تک پانچ روپے دے دو۔ پھر دیکھو تماشا۔۔۔"

سرفراز نے پُرجوش لہجے میں کہا۔۔۔ "میں تمھیں پانچ نہیں، دس روپے دوں گا، لیکن کل شام جب سارے دوست جمع ہوں تو تم اُسے مار مار کر اس کا دماغ درست کر دو۔ یہ۔۔۔ یہ میری عزّت کا سوال ہے۔"

ساجد ہنسا۔۔۔ "روپے وصول کرنے کے بعد تمھاری عزّت ہماری عزّت ہو جائے گی۔ اس اسکول میں جو بھی ہم پر بھروسہ کرتا ہے، وہ فائدے میں رہتا ہے۔۔۔"

سرفراز حیرت سے بولا۔۔۔ "تو کیا۔۔۔ تو کیا دوسرے لڑکے بھی معاوضہ دے کر تمھاری خدمات حاصل کرتے ہیں۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔" افتخار بولا۔۔۔ "طارق، فضل، جمیل، عالم، انیس، خورشید، حاطب اور راجہ۔۔۔ بے شمار لڑکے ہم سے مدد طلب کرتے ہیں اور ہم کسی کو کبھی مایوس نہیں کرتے۔ معقول معاوضہ ہو تو ہم جان کی بازی لڑا دیتے ہیں۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔" سرفراز بولا۔۔۔ "پیسے تمھیں کل مل جائیں گے۔ لیکن کل شام، ٹھیک پانچ بجے تم اسکول کے پیچھے بنے ہوئے گراؤنڈ میں پہنچ جاؤ گے۔ وہاں شہریار اور اس کے دوست موجود ہوں گے۔ ایک بار سب کے سامنے شہریار کی مرمّت کر دی گئی تو پھر وہ کبھی اکڑنے اور دھمکیاں دینے کے قابل نہیں رہے گا۔۔۔"

ساجد اور افتخار نے باری باری اس سے ہاتھ ملائے اور کہا۔۔۔ "کل شام ٹھیک پانچ بجے۔۔۔ گراؤنڈ میں۔۔۔"

اسی وقت گھنٹی کی آواز سُنائی دی۔ اسکول میں پڑھائی کا وقت شروع ہو چکا تھا۔

چھٹی کا وقت ہوا تو مختلف جماعتوں میں پڑھنے والے طالب علم جوق در جوق باہر نکلنے لگے۔ اتنے ہجوم میں کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ آج حق اسکواڈ کے چاروں ارکان، جو ہمیشہ ایک ساتھ اسکول آتے تھے اور ایک ساتھ واپس جاتے تھے، آج الگ الگ جا رہے ہیں۔

شہریار اکیلا نکلا ہی تھا کہ ساجد اور افتخار نے اُسے روک لیا۔

"کہاں جا رہے ہو اکیلے اکیلے...؟" ساجد نے کہا۔ "سُنا ہے تم لوگوں کو ہڈیاں توڑ دینے کی دھمکیاں دے رہے ہو"

شہریار نے انھیں چونک کر دیکھا۔ "کس نے بتایا ہے تمھیں...؟ اور تم کون ہو اس معاملے میں بولنے والے...؟ یہ میرا اور سرفراز کا جھگڑا ہے۔ ہمارے آپس کے جھگڑے میں تم کیوں ٹانگ اڑا رہے ہو...؟"

افتخار نے کہا۔ "ہم اپنی ٹانگ ہر جھگڑے میں اڑا سکتے ہیں۔ سرفراز ہمارا دوست ہے۔ جو کوئی اس کی ہڈیاں توڑنے کی بات کرے گا، ہم اس کے دانت توڑ دیں گے..."

اِن کی بحث چلتی رہی۔ بات بڑھنے لگی تو کچھ طالب علموں نے بیچ میں پڑ کے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ چند لڑکے شہریار کو سمجھا بجھا کر ایک طرف لے گئے اور کچھ لڑکے ساجد اور افتخار کو الگ لے گئے۔ یوں بات ختم ہو گئی۔

لیکن بات ختم نہیں ہوئی تھی۔

اگلے روز ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

صبح اسکول کے وقت لڑکے اپنی اپنی کلاسوں میں پہنچے تو انھیں بورڈ پر ایک نوٹس نظر آیا۔ سفید کاغذ پر سیاہی سے موٹے قلم کے ذریعے لکھا جانے والا نوٹس۔ کاغذ پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔

"سنسنی خیز مقابلہ"

"آج شام ٹھیک پانچ بجے... اسکول کے پیچھے بنے ہوئے میدان میں... اسکول کی تاریخ کا سب سے سنسنی خیز مقابلہ... ایسا مقابلہ آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا... ضرور تشریف لائیے... اپنے دوستوں کو بھی لائیے..."

کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ نوٹس کس نے لگائے ہیں! مقابلہ کون کرا رہا ہے...؟ آنے کی دعوت کون دے رہا ہے؟ لیکن ہر جانب اسی مقابلے کی باتیں ہونے لگیں۔ ہر ایک اسی مقابلے کا ذکر کر رہا تھا۔

دوپہر کو جب چھٹی ہوئی تو سارے اسکول میں اسی مقابلے کے چرچے تھے۔ ہر ایک پوچھ رہا تھا، کس کا مقابلہ ہے؟

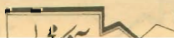

کس سے ہے؟ کس وقت پہنچنا ہے ... ؟ بے شمار لڑکے مقابلہ دیکھنے کے لیے آنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ اس روز ساجد اور افتخار اسکول نہیں آئے تھے۔ اس لیے انھیں معلوم بھی نہ ہو سکا کہ پورے اسکول کے طالب علموں کو کسی مقابلے کی اطلاع پہنچا دی گئی ہے اور وہ مقابلہ دیکھنے کے لیے آنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

شام ساڑھے چار بجے ساجد اور افتخار، سرفراز کے پاس پہنچے۔ سرفراز بے چینی سے اُنہی کا انتظار کر رہا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی وہ مُسکرانے لگا ... " خدا کا شُکر ہے تم لوگ آگئے۔ میں تو ڈر رہا تھا۔"

" ڈرنے کی کیا بات ہے ..." ساجد نے پتلون کو اپنی توند پر کِھسکاتے ہوئے کہا ... " تم نے ہمیں دس روپے دیے ہیں۔ اب تمھاری حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔"

" ایک بات بھی تمھیں بتانی تھی "... سرفراز نے کہا ...

افتخار نے اپنے بڑے بڑے بالوں کو سنوار کر کہا ... " کون سی بات ؟"

" شہریار نے اپنے کئی دوستوں کو بلایا ہے۔ وہ اُن سب کے سامنے میری ٹُھکائی لگانا چاہتا ہے۔ آج اس نے اسکول کے کئی لڑکوں کو اسکول کے پیچھے بنے ہوئے میدان میں آنے کی دعوت دی ہے ..."

" یہ تو اور بھی اچھی بات ہے ..." ساجد مُسکرایا ... " جتنے زیادہ لوگ ہوں گے، اتنا ہی اچھا ہے۔ سب پر ہماری دہشت بیٹھ جائے گی ..."

وہ میدان کی طرف روانہ ہوگئے۔

راستے بھر وہ سرفراز سے باتیں کرتے گئے۔ اسے اپنے کارنامے سُناتے گئے۔

لیکن جب ایک گلی سے گھوم کر وہ میدان کے پاس پہنچے تو ان کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔

میدان لڑکوں سے بھرا ہوا تھا ... !

سینکڑوں لڑکے وہاں ایک دائرے میں جمع تھے ... !!

اور ان سینکڑوں لڑکوں کے درمیان ... شہریار کھڑا مُسکرا رہا تھا ... !!

افتخار نے آہستہ سے کہا ... " یہاں تو پورا اسکول جمع ہے ..."

ساجد نے اُسے کُہنی مار کر کہا ... " بہت اچھا ہے ... سب کو ہماری طاقت کا علم ہو جائے گا ..."

وہ آگے بڑھتے گئے۔

لڑکوں نے انھیں دیکھ کر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

تالیوں کا شور ختم ہوا تو ضیاؔ نے اُٹھ کر کہا ...' حضرات ... آپ دیکھ رہے ہیں کہ مقابلہ شروع ہونے والا ہے شہر یار اور سرفراز آج یہاں ہم سب کے سامنے مقابلہ کریں گے ...'

" نہیں ..." سرفراز نے چلاّ کر کہا ..." میرے بجائے ساجد اور افتخار شہر یار سے مقابلہ کریں گے ..."

" یہ کیسے ہو سکتا ہے ..." ضیاؔ نے کہا ..." ایک کا مقابلہ ایک سے ہو سکتا ہے، دو سے نہیں۔"

شہر یار نے کہا ..." کوئی بات نہیں، میں مقابلہ کرنے کے لیے تیاّر ہوں، دونوں سے ..."

تالیوں کا شور پھر بلند ہوا۔ سب لڑکے شہر یار کی جرأت پر تالیاں بجا رہے تھے۔

ساجد اور افتخار حیران کھڑے تھے۔ انھیں توقع نہیں تھی کہ اس طرح پورے اسکول کے لڑکوں کے سامنے انھیں کوئی مقابلہ کرنا ہوگا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ مقابلہ کرنے سے انکار کر دیتے، لیکن اب شہر یار نے اکیلے ہی ان دونوں کو لڑنے کا چیلنج دے دیا تھا۔ اب اگر وہ انکار کرتے تو بڑی بے عزّتی ہوتی۔ پورے اسکول کے سامنے بے عزّتی ہوتی۔ ان کے لیے یہ بات اطمینان کا سبب تھی کہ دونوں کو مل کر اکیلے شہر یار سے ہی مقابلہ کرنا تھا۔ ایسے میں انھیں فتح یقینی نظر آ رہی تھی۔

ضیاؔ نے اعلان کیا ..." تو حضرات ...! اب یہ مقابلہ شہر یار اور ساجد اور افتخار کے درمیان ہوگا۔ ایک طرف ساجد اور افتخار ہوں گے اور دوسری طرف شہر یار ... کیوں شہر یار، منظور ہے ...؟"

شہر یار بولا ..." ہاں ... منظور ہے ..."

پھر ضیاؔ نے پوچھا ..." کیوں ساجد، تم دونوں کو بھی منظور ہے ...؟"

ساجد اور افتخار نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ساجد بولا ..." ہاں، منظور ہے۔ اگر شہر یار واقعی ہڈّیاں تڑوانا چاہتا ہے تو ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے ..."

ایک بار پھر تالیوں کا شور بلند ہوا اور کچھ لڑکوں نے نعرے لگانے شروع کیے۔

اسی بے پناہ شور میں وہ دائرے میں آ کھڑے ہوئے۔

اب ان کے چاروں طرف تالیاں بجانے والے طالب علم تھے اور سامنے شہر یار کھڑا تھا۔

ضیاؔ نے کہا ..." حضرات اب مقابلہ شروع ہو رہا ہے۔ سنبھل کر بیٹھ جائیے۔ اس مقابلے کے تین راؤنڈ ہوں گے پانچ پانچ منٹ کے تین راؤنڈ۔ مقابلے میں ہر طرح سے وار کرنے کی اجازت ہے۔ کشتی، باکسنگ، جوڈو کراٹے ... ہر داؤ آزمایا جا سکتا ہے۔ تو لیجئے، مقابلہ شروع ہوتا ہے۔"

ساجد اور افتخار نے سامنے کھڑے شہر یار کو دیکھا جو اب چوکنّا ہو کر انھیں ہی دیکھ رہا تھا۔

وہ آگے بڑھے۔

ہر جانب خاموشی چھا گئی تھی۔ سینکڑوں طالب علم انھیں دیکھ رہے تھے۔

افتخار نے اچانک شہریار پر چھلانگ لگائی۔ مگر شہریار تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ افتخار زمین پر گرتے گرتے بچا۔

کچھ لڑکے ہنسے... کچھ نے تالیاں بجا کر شہریار کو اس کی پھرتی پر داد دی۔

ساجد نے ایک قدم آگے بڑھا کر شہریار کے جبڑے پر وار کرنا چاہا۔ مگر شہریار اچانک نیچے بیٹھ گیا۔ ساجد کا مُکّا اس کے اُوپر سے گزر گیا۔

کچھ اور لڑکے ہنسے۔

ساجد اور افتخار کا غصّے سے بُرا حال تھا۔ بے شمار لڑکوں کے سامنے ان کے دو وار خالی گئے تھے۔

انھوں نے ایک ساتھ شہریار پر حملہ کر دیا۔

شہریار تیزی سے ایک طرف ہٹا اور ہنستے ہنستے اس نے ہاتھ گھمایا۔ اس کا ہاتھ ساجد کی کنپٹی پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر اپنے ہی ساتھی افتخار سے جا ٹکرایا۔ دونوں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر سنبھل نہ سکے اور گر پڑے۔

وہ پھر ایک ساتھ اُٹھے اور شہریار پر حملہ آور ہوئے۔

شہریار اُچھلا۔ اس کی لات افتخار کے پیٹ پر پڑی اور افتخار چیختا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی وقت شہریار کا گھٹنا پوری قوت سے ساجد کے ڈھول جیسے پیٹ سے ٹکرایا۔ ساجد پیٹ پکڑ کر جھکا۔ اس کے ساتھ ہی شہریار کا مُکّا اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔ ساجد اُلٹ کر پیچھے جا گرا۔ اس کے ہونٹ سے خون نکل رہا تھا۔

ساجد اور افتخار کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ لیکن وہ ہمت سے کام لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنے طالب علموں کے سامنے وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے شہریار کی طرف بڑھے۔ اسی وقت انھوں نے شہریار کو چھلانگ لگاتے اور فضا میں بلند ہو کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتے، شہریار کی لات کسی فولادی گرز کی طرح افتخار کے سر پر پڑی۔ اور اس کے آہنی ہاتھ نے ساجد کی کنپٹی پر کراٹے کا قوت سے بھرپور وار کیا۔ انھیں یوں لگا جیسے لوہے کی کوئی سلاخ ان سے ٹکرائی ہو۔ وہ ایک ساتھ چکرا کر زمین پر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

تالیوں کا شور اچانک بلند ہوا۔ بے شمار طالب علم خوشی سے بے حال ہو رہے تھے۔ پاگلوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ اور والہانہ انداز میں تالیاں بجا رہے تھے۔

انھوں نے شہریار کو کندھوں پر اُٹھا لیا۔ بے شمار لڑکے رقص کر رہے تھے۔ اور اُچھل اُچھل کر اُسے مبارکباد دے

رہے تھے ۔ جب تالیوں کا شور ختم ہوا تو شہریار نے چلّا کر کہا۔۔" ساتھیو۔۔۔ میں تم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔۔"

اچانک ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

سب لوگ شہریار کی بات سُننا چاہتے تھے۔ جس نے ان کی آنکھوں کے سامنے اپنے دو حریفوں کو شکست دی تھی

" میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں۔" شہریار نے کہا" کہ آپ سب یہ مقابلہ دیکھنے یہاں آئے، لیکن شاید آپ سب میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ مقابلہ دراصل میرا اور سرفراز کا مقابلہ نہیں تھا یہ ساجد اور افتخار کے خلاف حق اسکواڈ کی جنگ تھی۔۔۔"

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔۔۔

شہریار کی آواز ہر جانب گونج رہی تھی۔۔" سرفراز میرا گہرا دوست ہے، لیکن ساجد اور افتخار کو اس مقابلے پر راضی کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم ایک دوسرے سے جعلی جھگڑا کریں۔ سرفراز اس میں کامیاب ہوا اور وہ ساجد اور افتخار کو دس روپے دے کر یہاں لڑنے کے لیے لے آیا۔ ہمارا مقصد آپ سب کو یہ بتانا تھا کہ۔۔۔ افتخار اور ساجد جیسے لوگوں کو شکست دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ بُرائی کو یا بُرے آدمی کو ختم کرنے کے لیے بس ذرا سی ہمّت چاہیے۔ ساجد اور افتخار جو اس وقت آپ کے سامنے زمین پر بے بس پڑے ہوئے ہیں، اس اسکول میں غنڈہ گردی کر رہے تھے۔ ہم جیسے کئی عام طالب علم ان سے ڈرتے تھے۔ انھیں ہر ماہ رقم دیتے تھے۔ ان کی طاقت سے خوفزدہ رہتے تھے۔ میں ان بہت سے طالب علموں کے نام جانتا ہوں جو شرافت کی وجہ سے یا کمزور ہونے کی وجہ سے ان کا ہر ناجائز مطالبہ مان لیتے تھے، لیکن آج سب کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ کوئی بُرائی ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی، کوئی بُرا آدمی ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ آج آپ سب کے سامنے ان کی طاقت کی پول کھُل گئی ہے۔ اگر یہ سچ مچ طاقتور ہوتے تو دو ہونے کے باوجود ایک سے مار نہ کھاتے، لیکن دراصل ان کی برائی ہی ان کی اصل کمزوری تھی۔ ہم سب جب چاہیں، جہاں چاہیں اور جیسے چاہیں، برائی کو شکست دے سکتے ہیں۔ ذرا سی ہمّت، ذرا سا اتحاد، ذرا سا نظم و ضبط اور ذرا سا یقین درکار ہے۔ آج کے بعد سے کوئی انھیں غنڈہ ٹیکس نہیں دے گا۔ کوئی ان سے خوفزدہ نہیں ہوگا۔ کوئی ان کے سامنے نہیں جُھکے گا اور کوئی ان کے ناجائز مطالبات نہیں مانے گا۔ یقین رکھیے، دو بُرے لڑکے اتنے بے شمار طالب علموں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

ایک بار پھر تالیوں کا والہانہ شور بلند ہوا۔

اور اسی کے دوران سرفراز نے پوری قوّت سے چلّا کر کہا۔۔" حق اسکواڈ۔۔۔!"

اور اسکول کے سینکڑوں طالب علموں نے نعرے کا جواب دیا۔۔" زندہ باد۔۔۔!!"

اُن کا نعرہ دُور تک گونجتا گیا۔۔۔

●●●

امّ رباب جعفری

دائرۂ معلومات

چند ضروری ہدایات

دائرہ معلومات میں حصّہ لینے والے ساتھی چند ضروری باتوں کو ذہن میں رکھیں۔ جواب ارسال کرتے وقت آپ جو دائرہ کاٹ کر بھیجتے ہیں، اس میں موجود درست جواب پر نیلے بال پوائنٹ سے ترتیب وار نمبر لکھیں اور ساتھ ہی ایک جانب اپنا نام اور شہر کا نام بھی لکھیں، ادارے کی سہولت کے لئے ایک سادہ کاغذ پر بھی ترتیب وار درست جواب لکھ دیں۔ اس طرح آپ کے جوابات کا درست حل سے موازنہ کرنے میں ہمیں زیادہ آسانی رہے گی۔ لیکن ساتھ ہی اپنا نام اور مکمل پتہ لکھنا نہ بھولیں، کیونکہ اکثر ساتھیوں کا حل بالکل درست ہوتا ہے یا ایک غلطی ہوتی ہے، لیکن نام پتہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ حل مقابلے میں شامل نہیں کئے جاتے۔ اس کے علاوہ جو ساتھی تصویر بھیجتے ہیں، وہ تصویر کی پشت پر نام ضرور لکھا کریں۔

ستمبر میں دیئے گئے دائرہ معلومات میں کچھ غلطیوں کی طرف ساتھیوں نے توجہ دلائی ہے۔ اس کے مطابق پانچویں سوال "تحریکِ پاکستان" میں جو اشارے دیئے گئے ہیں، اس میں پہلے اشارے میں غلطی سے ۱۹۷۳ء لکھ دیا گیا تھا، وہ ۱۸۷۳ء ہے، جو کہ مولانا ظفر علی خان کا سنِ پیدائش ہے۔ چھٹے سوال "پاکستان کی عظیم شخصیات" میں دیئے گئے دوسرے اشارے میں غلطی سے غبارِ پریشاں لکھا گیا ہے۔ اصل لفظ "افکارِ پریشاں" ہے۔

بارہویں سوال "عالمی شخصیات نمبر ۲" کا درست جواب دائرے میں لوئی بیل لکھا گیا ہے، یہ نام لوئی بریل ہے۔ انیسویں سوال "علاقائی ادب" کا دائرے میں درست جواب جان درک لکھا گیا ہے، یہ نام جام درک ہے۔

ادارہ اس غلطی پر آنکھ مچولی کے ساتھیوں سے معذرت خواہ ہے۔

دائرہ معلومات ستمبر ۱۹۸۷ء کا درست حل

① حضرت ابراہیمؑ ② حضرت سلمان فارسیؓ ③ محمد بن قاسم ④ ظہیر الدین بابر

⑤ مولانا ظفر علی خان ⑥ جسٹس رستم کیانی ⑦ کوئٹہ ⑧ حواری بومدین

⑨ انڈونیشیا ⑩ واشنگٹن ڈی سی ⑪ فیلڈ مارشل منٹگمری ⑫ لوئی بریل

⑬ مادام کیوری ⑭ جابر بن حیان ⑮ الیگزینڈر فلیمنگ ⑯ محمد علی

⑰ اگاتھا کرسٹی ⑱ اکبر الہ آبادی ⑲ جام ورک ⑳ پیبلو پکاسو

انبیائے کرام	(i) حضرت ابراہیمؑ (ii) خانہ کعبہ (iii) حضرت ہاجرہؓ (iv) عید الاضحیٰ
صحابہ کرام	(i) امین الامّت (ii) عشرہ مبشرہ (iii) فردوسی (iv) ۱۰۳۰ء
تاریخ اسلام	(i) سبکتگین (ii) ۱۷ (iii) فردوسی (iv) ۱۱۳۰ء
تاریخ و پاک و ہند	(i) سراج الدین (ii) ۱۸۵۷ء (iii) ۱۸۶۲ء (iv) رنگون
تحریک پاکستان	(i) کرنال (ii) دست راست (iii) مکّہ (iv) ۱۹۵۱ء
پاکستان کی عظیم شخصیات	(i) جھنگ (ii) گورنمنٹ کالج لاہور (iii) طبیعات (iv) نوبل انعام
پاکستان کے شہر	(i) دریائے سندھ (ii) روشندان (iii) بیرون کوٹ (iv) غلام شاہ کلہوڑا
عالم اسلام (شخصیات)	(i) ترکی (ii) سلونیکا (iii) گرے وولف (iv) ۱۹۳۸ء
عالم اسلام (ممالک)	(i) فارس (ii) اسلامی انقلاب (iii) ریال (iv) آیت اللہ
دنیا کے بڑے شہر	(i) قدیم ترین شہر (ii) صلاح الدین ایوبی (iii) مسجد اموی (iv) شام
عالمی شخصیات (۱)	(i) فرانس (ii) ۱۹۵۸ء (iii) صدارت (iv) ۱۹۷۰ء
عالمی شخصیات (۲)	(i) مقدونیہ (ii) ارسطو (iii) پورس (iv) ۳۲۳ ق.م.
مشہور خواتین	(i) انگلستان (ii) جنگ کریمین (iii) نرسنگ (iv) ۱۹۱۰ء
مسلم سائنسدان	(i) صفر (ii) الجبر والمقابلہ (iii) ۷۸۰ء (iv) محمد بن قاسم
سائنس کی دنیا	(i) ایکس ریز (ii) نوبل انعام (iii) ۱۸۴۵ء (iv) ۱۹۲۳ء

مشہور کھلاڑی	(i) ۱۹۱۶ (ii) پشاور (iii) اسکواش (iv) عالمی چمپئین
عالمی ادب	(i) روس (ii) جنگ اور امن (iii) اینا کیرنینا (iv) ۱۹۱۰ء
اردو ادب	(i) مولوی محمد باقر (ii) ذوق (iii) آب حیات (iv) کربلا گامے شاہ۔ لاہور
علاقائی ادب	(i) ۱۱۰۲ھ (ii) شاہ جو رسالو (iii) بھٹ شاہ (iv) ۱۱۶۵ھ
فنون لطیفہ	(i) ہالینڈ (ii) مصوّر (iii) خودکشی (iv) ۱۸۹۰ء

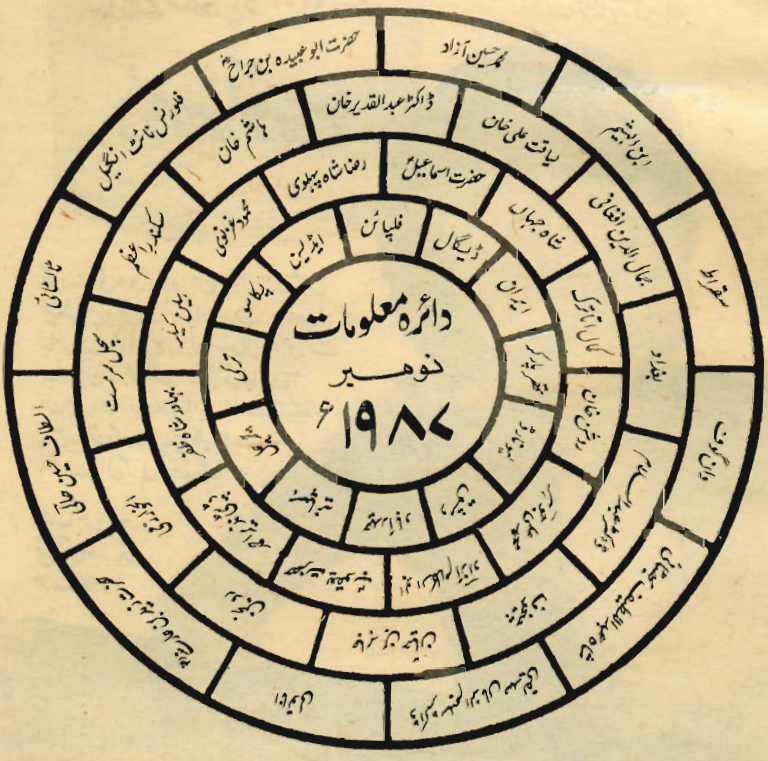

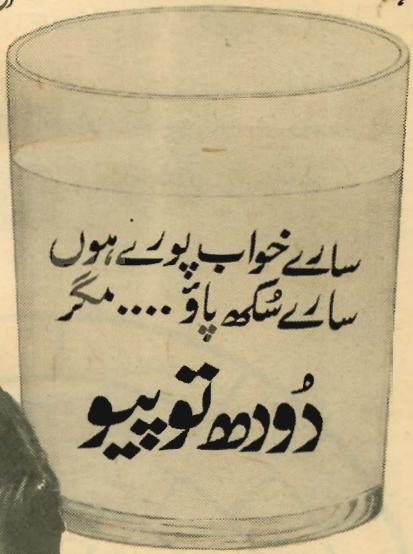

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت۔ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
مستقبل کی بڑی ذمّہ داریوں کے لئے ابھی سے اپنے ذہن کو تروتازہ اور جسم کو توانا رکھئے
غیر متوازن غذائیں انسانی جسم کی تمام ضروریات پوری نہیں کرتیں۔
دودھ واحد غذا ہے جو انسانی جسم کو زیادہ سے زیادہ قوّت فراہم کرتی ہے۔
سارے خواب پورے ہوں
سارے سُکھ پاؤ .... مگر
دُودھ تو پیو
قدرت کی عطا کردہ اِس انمول نعمت میں کیلشیم، پروٹین، وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا شامل ہیں۔ دُودھ کا روزانہ استعمال۔ اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہے
دن میں دو بار دودھ پینا اپنی عادت بنالیجئے۔
چاہیں تو دُودھ میں چاکلیٹ یا شربت ڈال کر پی سکتے ہیں۔
یوں گویا۔۔
غذا کی غذا
مزے کا مزا
مشتہر برائے بہبود اطفال، منجانب ماہنامہ آنکھ مچولی، کراچی

MASS

۳ خوش نصیب ساتھی، جو بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حقدار قرار پائے

○ ایم رفیق زاہد ـــــ شاہی بازار۔ گوادر (بلوچستان)
○ محمد جرار صدیقی ـــــ لطیف آباد، حیدرآباد
○ نشو پروین ـــــ ایف سی ایریا۔ کراچی

درست جوابات ارسال کرنے والے ذہین ساتھیوں کے نام اور تصاویر

ریاض احمد
پٹھان کالونی۔ کوٹری

سید فرحان فرید
لطیف آباد حیدرآباد

ولید یعقوب
گڑھی شاہو۔ لاہور

محمد جرار صدیقی
لطیف آباد، حیدرآباد

سید ظہور احمد زیدی
لانڈھی نمبر ۱۔ کراچی

عبدالقدیر
کراچی

پرویز خان اشرف
رانچھوڑ لائن، کراچی

محمد ندیم اصغر
عثمان آباد۔ کراچی

○ تصویر زہرا، لیاقت روڈ، راولپنڈی ○ محمد یونس بنی، ایم اے جناح روڈ، سانگھڑ ○ سعید احمد، گورنمنٹ ہائی اسکول ٹنڈو آدم
○ سید اسد معروف، پشاور ○ معراج سعادت، لطیف آباد حیدرآباد ○ سید ظہور احمد، لانڈھی نمبر ۱، کراچی
○ شارق شمیم، آگرہ تاج کالونی کراچی ○ فرح ناز عزیز، جیلانی روڈ، سکھر ○ عبدالماجد قادر خانزادہ، حیدرآباد
○ منصور احمد، گڑھی شاہو۔ لاہور ○ نوید احمد صدیقی، فیڈرل بی ایریا کراچی ○ سعید احمد، شالیمار، اسلام آباد
○ عرفان قمر، زمان پارک، لاہور ○ کاشف شکور غزل، سانگھڑ ○ ظہیر الٰہی بابر، ریلوے کالونی، حیدرآباد
○ آفرین اشتیاق، ناظم آباد ○ ذوالفقار حیدر، حسینی منزل، سانگھڑ ○ انیقہ صدف، شاہی بازار، حیدرآباد

- تجمل الیاس، سمن آباد، لاہور
- امتیاز احمد خان، ملیر ہالٹ کراچی
- محمد افراہیم شیخ، شاہ عبداللطیف اسکول ٹنڈو آدم
- محمد حبیب، چوک یادگار، پشاور
- محمد عمران ناظم، گلبرگ، کراچی
- محمد ارشد خان، ملیر ہالٹ کراچی
- ساجد حبیب، تالیمار لیف ۵ اسلام آباد

ایک سے غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام

- ہما شعیب، شیر شاہ کالونی، کراچی
- شہانہ شمشاد، شو مارکیٹ کراچی
- محمد سلمان شیخ، عامل کالونی حیدرآباد
- فاخرہ فاروق مان، سیالکوٹ کینٹ
- بصیر الدین گاہوٹھی، طالب المولیٰ کالونی نیوہالہ
- احسان بیگ، کارساز، کراچی
- جاوید اقبال، ملیر ہالٹ، کراچی
- عامر نعمان، نارتھ کراچی
- رخشندہ تابندہ ریاض، باغبانپورہ لاہور
- سلمان عبداللہ، رفاہِ عام سوسائٹی کراچی
- الیاس فاروق، ملیر، کراچی
- نجیب الدین محمد، یونیورسٹی کیمپس، پشاور
- سید جاوید حیدر شاہ، سٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی
- شہناز احمد، ڈاکخانہ نشاط آباد فیصل آباد
- نوشین شبیر، نوشہرہ چھاؤنی
- رخشندہ مہدی حسین، گنگزیل سکھر

- اسماعیل عبدالرحمٰن، میٹھادر، کراچی
- صدف موسیٰ محمد، میٹھادر، کراچی
- محمد بہرام خان، آرڈی نینس اسٹیٹ کراچی
- روح اللہ، پیپلز کالونی، فیصل آباد
- محمد آصف النظر، لاوہ، ضلع چکوال
- کوکب بزمی، سعود آباد، کراچی
- محمد اشتیاق خان لاوہ ضلع چکوال
- محمد سعد فیصل، محمد سلمان حمزہ، سٹلائیٹ ٹاؤن، رحیم یار خان
- ارشد حسین، ریلوے اسٹیشن، حیدرآباد
- عادل مجید سونی، آدم جی نگر، کراچی
- ندیم میمن، فقیر کا پڑ، حیدرآباد
- نعمت اللہ سومرو، قادر بخش ساند
- ارم گل، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور
- ضیا آگرو، لیاقت روڈ، حیدرآباد
- عائشہ رفعت، ٹاؤن شپ، لاہور
- خرم حسین شفیق، ڈرگ کالونی، کراچی
- عاصمہ گل، جہانگیر پورہ، پشاور
- راحت صلاح الدین، منگھوپیر روڈ کراچی
- عاصم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال کراچی
- خرم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال، کراچی
- ساجد جمیل، سعود آباد، کراچی
- فصیل مختار صدیقی، ڈسٹرکٹ دادو
- صداقت حیات، لاوہ، ضلع چکوال
- شکیل احمد، جمرود، خیبر ایجنسی
- رخسانہ حبیب، موسیٰ لین، کراچی

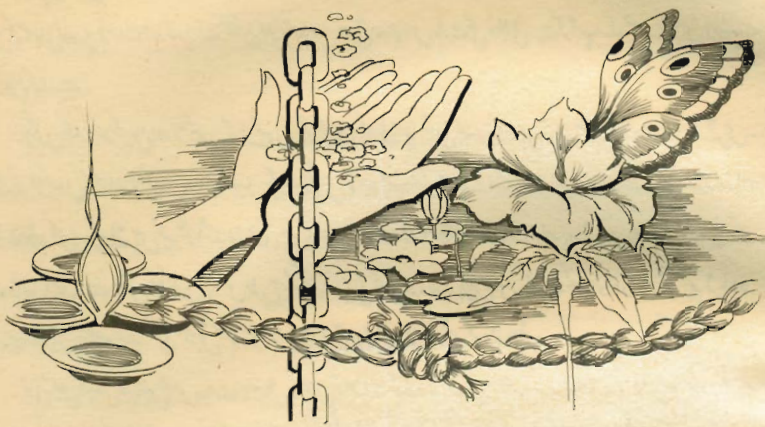

آدابِ زندگی

کھیل کے آداب

ع ، الف صدّیقی

کھیل کود جسمانی و ذہنی صحت اور نشوونما کے لیے بہت ضروری ہے، کھیل کود سے بالکل دُور رہنے والے بچّے صحت مند نہیں ہو سکتے۔ صحت مند دماغ کے لیے صحت مند جسم بہت ضروری ہے۔ اور جسم کو صحت مند رکھنے کے لیے مناسب انداز میں کھیل کود لازمی ہے۔ لیکن کھیل کود بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ زندگی میں بحیثیت مسلمان اور پاکستانی جو اعلیٰ کارنامے انجام دینے ہیں اور ملک و قوم کا نام روشن کرنا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ جسم میں جان ہو، عقل و دماغ میں قوت ہو، ارادوں میں مضبوطی ہو، حوصلے بلند ہوں اور دل اُمنگوں، ولولوں اور اعلیٰ جذبات سے بھرپور ہو اور اِن نیک مقاصد کے لیے کھیل کو مناسب انداز میں اپنی زندگی کا اہم جزو بنایا جائے۔

آج کل بے شمار کھیل رائج ہیں جن میں کرکٹ، ہاکی، فٹبال، ٹیبل ٹینس، بیڈمنٹن، والی بال، باسکٹ بال، پولو، اسکیٹنگ

وغیرہ شامل ہیں کھیل کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس کھیل سے واقعی جسم کی نشوونما ہوتی ہو اور اُسے کھیل کر جسمانی طور پر فرحت اور قدرے تھکن بھی محسوس ہوتی ہو جو اس بات کی نشانی ہے کہ آپ کے جسم نے اس کھیل سے اثر قبول کیا ہے۔

لڑکوں کو مردانہ کھیل اور لڑکیوں کو لڑکیوں کے کھیل کھیلنے چاہئیں کیوں کہ وہی اُن کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ اگر لڑکے لڑکیوں کے اور لڑکیاں مردانہ کھیل کھیلنے لگیں تو وہ فائدے کی بجائے الٹا نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔ لڑکے زیادہ تر آؤٹ ڈور کھیل کھیلتے ہیں کیونکہ آئندہ زندگی میں اُنھیں مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے بدن اور دِل ودماغ کو مضبوط بنانا ہوتا ہے لیکن لڑکیوں کو اس طرح کے کھیلوں کی کوئی ضرورت نہیں ان کے لیے گھریلو اور اِن ڈور گیم زیادہ مفید ہوتے ہیں جیسے بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس، لوڈو، گڑیا بنانا، جھولا جھولنا، رسّی کودنا وغیرہ۔

کوئی بھی کھیل کھیلیں تو اس بات کا خیال رکھیں کہ جیت کو لازمی طور پر مقصد نہ بنالیا جائے، چاہے اس کے لیے بے ایمانی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اعلیٰ کردار کا تقاضا ہے کہ اگر ہار رہے ہوں تو خندہ پیشانی سے اپنی شکست تسلیم کرلیں۔ اور جیت رہے ہوں تو دوسرے فریق کا مذاق نہ اُڑائیں۔ اس لیے کہ کھیل میں ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔

کھیل کے دوران شائستگی، شرافت، ایمان داری اور رواداری کا خیال رکھنا چاہیئے۔ مخالف کھلاڑیوں پر طنز و طعن ہُوٹنگ اور اوچھی حرکتوں سے آدمی کا وقار مجروح ہوتا ہے اور مخالف کے دِل میں نفرت اور غصّے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح اپنے کھیل کی طرف سے بھی توجہ ہٹ جاتی ہے اور کھیل کا مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے۔

کھیل کود پر توجہ دیتے وقت اعتدال ملحوظ رکھیے۔ پڑھائی ہو یا کھیل انتہا پسندی کسی طور بھی مناسب نہیں۔ دن دن بھر کھیل میں مشغول رہنا اور پڑھائی لکھائی سے بالکل لاپروائی اختیار کرلینا سخت نادانی ہے اور ایسے بچے عملی زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

کھیل کے دوران گالم گلوچ، غصّہ، غیظ و غضب تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے۔ اس سے آپ کے بارے میں ناخوشگوار تاثر اُبھرتا ہے۔ جیت یا ہار ہر دو صورتوں میں نتائج کو خندہ پیشانی سے تسلیم کرنا ہی بہادری اور اعلیٰ ظرفی ہے۔ بے مقصد اور لایعنی کھیل کھیلنے کی بجائے ایسے کھیل کھیلئے جو آپ کی آئندہ زندگی میں کام آنے والے ہوں۔ اسکول، کالج کے ساتھی ہوں یا محلّے کے دوست، کھیل ان سب سے قریبی دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا بھی سبب بنتے ہیں اور جو بچے کھیلوں میں حصّہ نہیں لیتے وہ اچھے اور قریبی دوستوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اچھے دوست بنانے کے اس ذریعے سے ضرور فائدہ اٹھائیے اور صحت مند کھیل، کھیل کر ذہنی وجسمانی صحت کے علاوہ صحت مند اور تندرست دوست بھی بنائیے۔

ایک روز مُلا نصرالدین زمین پر جھکے ہوئے کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک راہ گیر نے پوچھا "کیوں بھئی کیا کھو گیا ہے۔؟"

مُلا: "میری چابی گر گئی ہے"۔

راہ گیر ان کے ساتھ مل کر چابی ڈھونڈنے لگا۔ جب کافی دیر تلاش کے باوجود چابی نہ ملی تو اس نے مُلا سے پوچھا۔ "چابی گری کہاں تھی؟"

"وہ تو گھر میں گری تھی" مُلا نے جواب دیا۔

راہ گیر: "پھر یہاں کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟"

مُلا: "وہاں اندھیرا ہے"

حیدر عباس بھٹی ——— ڈیرہ غازی خان

ایک خاتون تھانے میں رپورٹ درج کرانے پہنچیں "انسپکٹر صاحب! ایک سال قبل میرے شوہر بازار آلو خریدنے گئے تھے، لیکن آج تک نہیں لوٹے بتایئے کیا کروں؟"

انسپکٹر صاحب سنجیدگی سے بولے "آپ کوئی دوسری سبزی پکالیں۔"

سندس ملک، ——— کراچی

احمد: "جب بھی ٹرین کا حادثہ ہوتا ہے تو اگلے ڈبوں کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے"۔

انور: "یہ ریلوے والے ہوتے ہی بیوقوف ہیں۔ بھلا اگلے ڈبے لگانے کی کیا ضرورت ہے"!

محمد سلمان خان سنبل ——— بورے والا

ایک صاحب: (اپنے مہمان سے) "آیئے آیئے تشریف لایئے"

مہمان: "مگر کہیں یہ کتا کاٹتا تو نہیں؟"

وہی صاحب: "یہی تو میں آزمانا چاہتا ہوں۔ میں نے یہ کتا آج ہی خریدا ہے"!

ارم فضل ——— کراچی

عثمان: "امجد تمہارے بال کیوں گر رہے ہیں؟"

امجد "فکر سے"

عثمان: "کس بات کی فکر سے؟"

امجد: "بال گرنے کی فکر سے"

محمد سلمان خان سنبل ——— بورے والا

ایک شخص مسجد میں نماز پڑھنے گیا۔ دوران نماز کسی نے اس کا جُوتا چُرا کر مندر میں رکھ دیا، جو مسجد کے قریب ہی واقع تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر شخص مذکور نے اپنا جوتا تلاش کیا تو مندر میں رکھا پایا۔ کہنے لگا "تیرا بُرا ہو۔ میں اسلام لایا، تو ہندو ہو گیا۔"

راحیل انور ـــــــ چک ۹۴۳ ڈاکخانہ خاص

اطہر (جاوید سے) "تم نماز پڑھنے کے بعد دُعا مانگنے کے لئے مینار پر کیوں چڑھ جاتے ہو؟"

جاوید: "تاکہ میری دُعا سب سے پہلے اللہ میاں تک پہنچ جائے۔"

خالد علی خان ـــــــ شہدادپور (سانگھڑ)

نوجوان ادیب: "میں آپ کے پرچے میں شائع کرانے کے لئے ایک کہانی لایا ہوں۔"

ایڈیٹر: "پڑھ کر سنائیے"

نوجوان نے کہانی پڑھ کر سنائی۔ اور دریافت کیا "مجھے اس کے بدلے کیا ملے گا؟"

ایڈیٹر: "میں ایڈیٹر ہوں، کوئی مجسٹریٹ نہیں، جو آپ کو سزا دوں"

سلطانہ حفیظ ـــــــ عزیز آباد کراچی

فوجی افسر (کیمپ کے سپاہی سے) "تمہارے بال اتنے بڑھے ہوئے ہیں، کٹواتے کیوں نہیں؟"

سپاہی: "جناب کس سے کٹواؤں؟"

فوجی افسر: "کیوں کیمپ کا حجام کہاں گیا؟"

سپاہی: "جناب میں ہی حجام ہوں۔"

شمائلہ احسن، ندیم احسن ـــــــ اٹک کینٹ

شوہر نے کہا "ارے بیگم! جلدی آؤ تمہاری والدہ کا فون آیا ہے۔ وہ صرف ایک منٹ تم سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں جلدی فون سنبھالو میں تمہارے لئے کرسی لے کر آتا ہوں!"

شکیلہ شیرازی ـــــــ ٹنڈو آدم

رات کے وقت دو دوست موٹر سائیکل پر کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں پٹرول ختم ہو گیا۔

ایک دوست بولا "اب گھر کیسے پہنچیں گے؟"

دوسرا دوست "ٹارچ روشن کر لیں گے۔"

اورنگزیب، سڈھانڈی ـــــــ ضلع چکوال

مالک مکان (کرایہ دار سے) "آج آخری بار کہنے آیا ہوں کہ کرایہ ادا کر دیجئے"۔

کرایہ دار (ہنستے ہوئے) "آپ کی بڑی بڑی نوازش! بالآخر روز روز کی تو تو میں میں کا خاتمہ تو ہوا۔"

محسن بلوچ ـــــــ مکران ـ بلوچستان

دو عقاب فضا میں بہت اُونچے اُڑ رہے تھے کہ ایک جیٹ طیارہ ان کے قریب سے شعلے اور دھواں چھوڑتا ہوا گزر گیا۔

"بڑا عجیب سا پرندہ تھا" ایک عقاب بولا "مگر یہ اس قدر تیزی سے کیوں جا رہا تھا"

"عجیب عقاب ہو تم بھی" دوسرے نے جواب دیا "اگر تمہاری دُم میں آگ لگی ہو تو کیا تم تیزی سے نہیں اُڑو گے"

بھاءالدین گاہوٹھی ـــــــ نیو ہالا

استاد: اسکول میں تمہارے لئے کونسا وقت سب سے اچھا ہوتا ہے۔
شاگرد: جناب چھٹی کا وقت!

قاسم محمود ——— راولپنڈی

ایک کسان نے بنک سے دو ہزار روپے قرض طلب کئے۔ منیجر نے پوچھا "کیا ضمانت دو گے؟"
کسان نے کہا "میرے پاس چالیس گائیں ہیں"
کسان کو رقم مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد کسان ایک رقم لے کر آیا اور اس میں سے دو ہزار گن کر بنک کو واپس دے دیئے۔ بنک منیجر نے کہا "آپ باقی رقم بھی ہمارے پاس جمع کرا سکتے ہیں"
کسان نے اُسے گھور کر دیکھا اور بولا "تمہارے پاس کتنی گائیں ہیں؟"

حافظ محمد اکرم سیالوی تحصیل ننکانہ صاحب

بچہ: ابا جان روپے کیسے بنتے ہیں؟
ابا جان (غصے میں تھے) مجھ سے کیا پوچھتے ہو، رکشہ میں بیٹھ جاؤ پتہ چل جائے گا۔

محمد کامران شاہد ——— کراچی

دو دوست کھانا کھا رہے تھے ایک نے دوسرے سے کہا۔
"تم میری ماں بن جاؤ اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤ"
کھانا کھانے کے بعد دوسرے نے کہا۔
اب تم میرے باپ بن جاؤ اور بل ادا کر دو!

شفیق الدین ——— لطیف آباد حیدرآباد

ایک خاتون اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھیں "آج ریستوران میں رخشندہ نے لنچ کے بعد جو تقریر کی وہ جتنی مختصر تھی اتنی پسندآئی"
"رخشندہ نے کیا کہا تھا؟
رخشندہ نے صرف اتنا کہا تھا کہ آج کا بل میں ادا کروں گی۔"

رفعت یونس ——— لسبیلہ، کراچی

جج (ملزم سے) "کل صبح تمہیں پھانسی دے دی جائے گی۔"
ملزم (خوف زدہ ہو کر) نہیں نہیں، اس سے تو مر جانا بہتر ہے۔"

اختر حسین ——— کراچی

تاریخ کے استاد لیکچر دے رہے تھے وہ آندھی اور طوفان کی رفتار سے آگے بڑھتا رہا کئی لوگوں نے اسے روکنے کی کوشش کی پیسوں کا لالچ دیا ڈرایا دھمکایا پولیس نے اس کے خلاف رپورٹیں بنائیں مگر اس کے عزائم اور رفتار میں کمی نہیں آئی آپ جانتے ہیں وہ کون ہیں۔
"ٹرک ڈرائیور" ایک طالب علم نے جواب دیا۔

محمد نعیم شفیع ——— بہاولپور

ایک شخص ایک عورت کے ساتھ تیز تیز جا رہا تھا راستے میں اس کا دوست ملا۔ اس نے پوچھا "اتنی تیز جا رہے ہو کیا ماجرا ہے؟" "یہ ماجرا نہیں بھائی (میری بیوی حاجرہ ہے)"

حسن مشہدی خراسانی ——— کراچی

سب سے اچھی چیونگ گم
جوجو کی یہ ببل گم
کھیل کا کھیل
لذّت کی لذّت
Bubble Gum
گلف فوڈ انڈسٹریز گوجرانوالہ (پاکستان)

مشاغل کی کہانی
سید عقیل عباس جعفری

گھریلو باغبانی

پھولوں کی آرائش اور گھریلو باغبانی ایک ایسا مشغلہ ہے جو بچوں، ہی میں نہیں بڑوں میں بھی یکساں مقبول ہے۔ گھر کے ایسے تمام کمرے اور مقامات جہاں سورج کی روشنی اور ہوا کا باآسانی گزر ہو چھوٹے اور خوبصورت پودوں سے سجائے جا سکتے ہیں۔ اِن پودوں کو اُگانے کے لیے کوئی بہت زیادہ اہتمام بھی نہیں کرنا پڑتا۔ بعض اوقات یہ پودے چھوٹی چھوٹی بوتلوں میں بھی برسوں تروتازہ رہتے ہیں۔ مٹی، چینی اور شیشے کے ایسے خوبصورت برتن جو گھر میں ناقابلِ استعمال ہو چکے ہوں۔ گلدان کے طور پر استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ کو گھر میں شیشے کا کوئی ایسا برتن نہ مل سکے تو بازار سے شیشے کی پرانی بوتلیں اور خوبصورت جارلے کر، جن پر ڈھکن بھی ہو، استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے پتّوں والے پودے بوتلوں میں لگانے کے لیے سب سے بہترین ہوتے ہیں کیونکہ اُن کی نمو آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ یہ پودے ایک طویل عرصے کے لیے اپنے اندر نمی جذب کر لیتے ہیں۔ اِس لیے انھیں بار بار پانی دینے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ پودے گرد، کیڑے مکوڑوں اور تیز ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رہتے ہیں اور دیر تک تروتازہ رہتے ہیں۔ ان گلدانوں کی تیاری میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی پھر بھی اس میں سلیقہ، خوبصورتی اور جدّت طرازی کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔

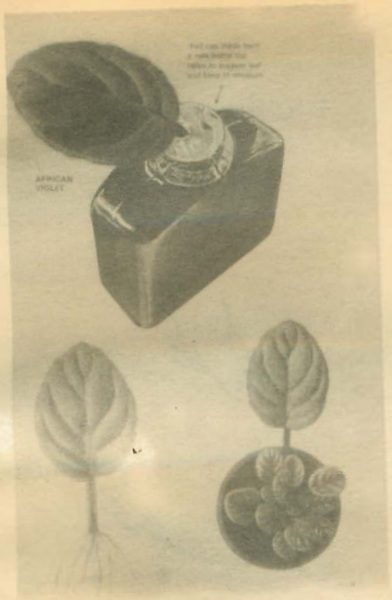

بوتل میں پودے لگانے کے لیے اشیاء :۔ پودا لگانے کے لیے سب سے پہلی ضرورت تو ایک مناسب بوتل کا حصول ہے۔ اس کے بعد کی ضروریات چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ چند چھوٹے چھوٹے پتھر۔

۲۔ کھاد

۳۔ ایک یا دو چھڑیاں۔ جن کی مدد سے آپ پودے کو بوتل میں منتقل کر سکیں۔

اگر آپ کی بوتل تنگ منہ کی ہے تو اس کے لیے آپ کو کاغذ کی قیف کی ضرورت پڑے گی جس کی مدد سے آپ کھاد اور پودا بوتل کے اندر ڈال سکیں۔

بوتل میں لگائے جانے والے پودوں کی تیاری :۔ سب سے پہلے چھوٹے پتھروں کو دھولیں اور آہستگی سے اُنھیں بوتل میں منتقل کر دیں۔ پتھر صرف اتنی مقدار میں ڈالے جائیں جو بوتل کے پیندے کو ڈھک لیں اس کے بعد کاغذ کی ایک قیف بنائیں اور اُسے بوتل کے منہ پر رکھ دیں اس میں ۳ سے ۵ سینٹی میٹر تک کھاد اور چارکول ڈالیں۔ یہ کاغذ کی قیف بوتل کے کناروں کو گندا ہونے سے بچاتی ہے۔ پھر ایک چھڑی کی مدد سے کھاد میں ایک سوراخ بنائیں اور کاغذ کی قیف یا دو چھڑیوں کی مدد سے پودے کو اس میں منتقل کر دیں۔ اب ایک یا دو چھڑیوں کی مدد سے پودے کو سیدھا کر دیں۔ اور اس کے ارد گرد کی مٹی کو برابر کر دیں اور اس پودے کی جڑوں کو مکمل طور پر مٹی سے ڈھک دیں۔

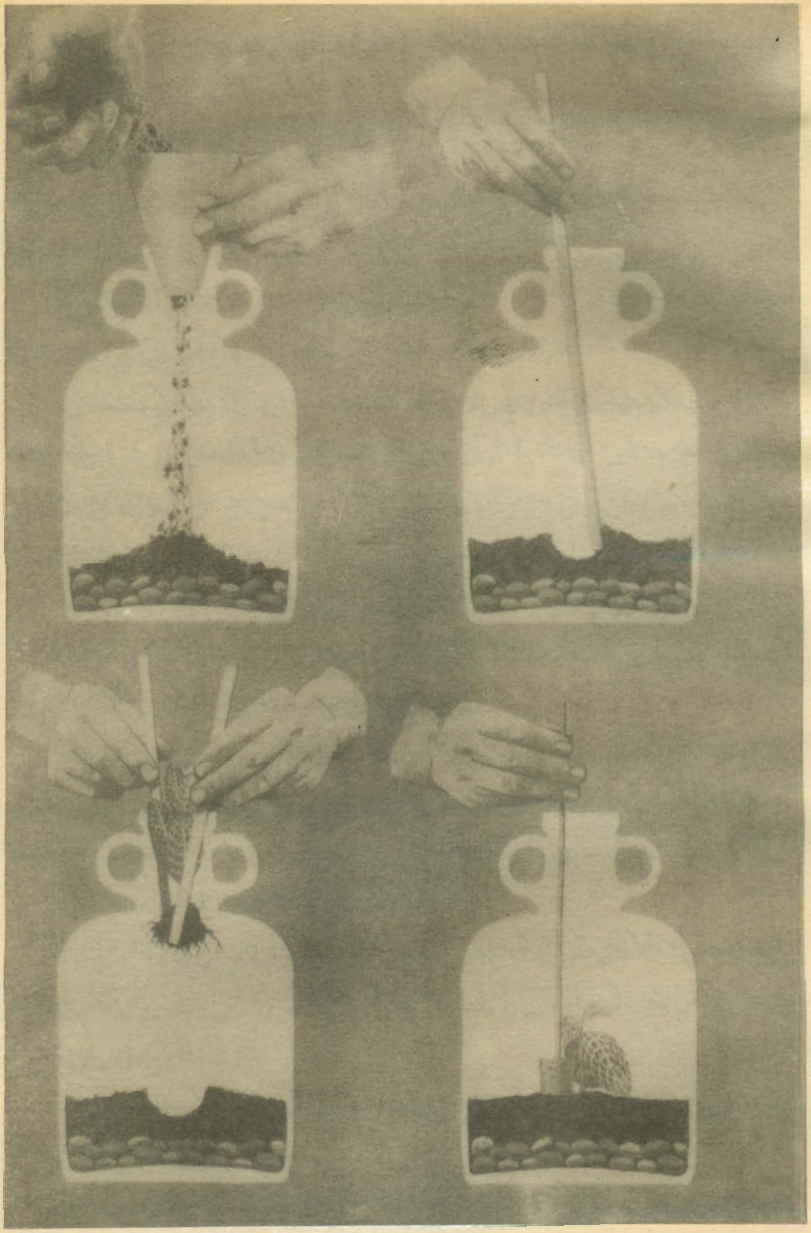

کوشش کریں کہ اس عمل میں چھوٹے پودے استعمال کیے جائیں یہ چھوٹے پودے آپ کو گھر کی قریب ترین نرسری سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

جب آپ کی یہ بوتل تیار ہو جائے تو اُس کی مٹی کو ذرا سا نم کر دیں اور بوتل کے اوپر ڈھکن ڈھک دیں۔ اس کے بعد یہ کئی سالوں تک بغیر پانی کے محفوظ رہے گا، لیکن اس کے باوجود خشک پتوں، مرجھائے ہوئے پھولوں اور فالتو اُگے ہوئے حصّوں کو تیز چاقو کی مدد سے کاٹ کر انھیں دو چھڑیوں یا ایک باریک چمٹی کی مدد سے بوتل سے باہر نکال دینا چاہیئے۔

گُل دان کا انتخاب:۔ گلدان کے لیے مختلف سائز اور شکل وصورت کے برتن دستیاب ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات گھر کی پُرانی چائے دانی بھی ایک خوبصورت گلدان کے طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔

اس مقصد کے لیے ایسے برتن بھی جو ذرا سے ٹوٹ گئے ہوں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ایسے برتنوں میں پانی بھر کر دیکھیں اگر اُن میں سے پانی ٹپک رہا ہو تو ان کے پیندے میں پولی تھین یا ٹن فوائل لگا دیں۔ اس کے بعد پیندے میں چھوٹے چھوٹے پتھر یا چارکول بچھا دیں۔ اسی طرح دھات کے برتن میں پینٹ کر کے اس میں پولی تھین کی تھیلی بچھا کر اس پر پتھر بچھا کر اُسے گلدان میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

اگر آپ مٹی کے برتن استعمال کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انھیں چند گھنٹوں کے لیے پانی میں ڈبو دیں۔ مٹی کے گملوں کو اگر آپ کسی اسٹینڈ میں لگانا چاہتے ہیں تو ان کے پیندے میں چھوٹے چھوٹے پتھر بچھا دیں یا کسی ٹوٹے ہوئے برتن کا ٹکڑا رکھ دیں تاکہ اگر ان میں کوئی سوراخ ہو تو اس میں سے پانی ٹپکنے نہ پائے۔

بیجوں سے پودے اُگانا:۔ پھلوں کی گٹھلیوں اور بیجوں سے پودے اُگانا بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ اگر آپ بلوط کے پھل کی گٹھلی کو ایک پانی سے بھری ہوئی بوتل کے منہ پر اس طرح رکھ دیں کہ پانی اس گٹھلی کو چھوتا رہے تو آپ دیکھیں گے کہ جلد ہی اس میں سے جڑیں پھوٹ پڑیں گی۔ اس کے بعد آپ اس پودے کو گھاد والے گملے میں منتقل کر دیں جس کے بعد وہ مزید پھلنا پھولنا شروع کر دے گا۔

آپ کچّی مونگ پھلی بھی گملے میں اُگا سکتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مونگ پھلی کے چھلکے کو آہستگی سے درمیان میں سے توڑ دیں تاکہ اُس میں سے جڑیں آسانی سے نکل سکیں۔ اگر آپ ایک گملے کی مٹی میں دو یا تین مونگ پھلیاں دبا دیں تو دو سے تین ہفتوں میں یہ پودے اُگ آئیں گے۔

پھل اُگانے کے لیے ایسے پھلوں کی گٹھلیوں کا انتخاب کریں جو بالکل پکّے ہوئے ہوں یا گلنے والے ہوں کیونکہ ایسے پھلوں کی نشوونما بہت اچھی طرح ہوتی ہے۔

اپنی آسانی کے لیے آپ ہر گملے پر پودے کا نام لکھ کر لگا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر آپ اسے بونے کی تاریخ بھی لکھ

لیں تاکہ آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ کس پودے کو اُگنے میں کتنا عرصہ درکار ہوتا ہے۔

بہت سے پھلوں (جیسے آڑو اور کھجور) کی گٹھلیاں اور بیج اگر دو دن کے لیے ایک کپ پانی میں ڈال کر رکھ دیے جائیں تو وہ بہت تیزی سے بڑھیں گے۔ گریپ، فروٹ، سنگترہ، اور لیموں کے بیج سے کونپلیں تین ہفتوں میں نکل آتی ہیں۔ انھیں ایک پولی تھین کی تھیلی میں مٹی اور کھاد ڈال کر تھیلی کو اوپر سے کس کر باندھ دیں۔ جب اس طرح ان میں پتّیاں نکلنی شروع ہو جائیں۔ تو انھیں کسی گملے یا برتن میں ڈال کر کسی گرم جگہ رکھ دیں۔

تراش خراش :- تراش خراش کے ذریعے پودوں کی افزائش کا طریقہ بھی باغبانی کا ایک دلچسپ حصّہ ہے آپ کسی بھی پودے کی ایک شاخ لے کر اُس کے نچلے حصّے کے پتّوں کو شاخ کے تنے سے علیٰحدہ کر لیں۔ اس طرح ایک لمبی سی شاخ تیار ہو جائے گی۔ جس کے صرف اوپر کے حصے میں پتّے ہوں گے اس شاخ کو آپ گملے یا شیشے کے مرتبان یا بوتل میں مٹی اور کھاد ڈال کر کسی گرم مقام پر رکھ دیں۔ خیال رکھیں کہ ان پودوں پر براہِ راست سورج کی روشنی نہ پڑے اور شاخ کی لمبائی ۲۲ سینٹی میٹر سے زیادہ نہ ہو۔

ان پودوں کو شیشے کی بوتل یا مرتبان میں رکھنے سے آپ کو ان کی بڑھوتری کا اندازہ بھی ہوتا رہے گا۔ یہ پودے موسم بہار اور موسم گرما میں بہت تیزی سے پروان چڑھتے ہیں۔

اس قسم کے پودوں میں آپ پارسلے، پودینہ، ہرا دھنیا اور اسی قسم کے دوسرے پودے، باآسانی لگا سکتے ہیں جو فائدہ مند بھی ہوتے ہیں اور خوبصورت بھی۔

پتّے اگانا :- پتّوں کے ذریعے پودے اُگانا آسان اور دلچسپ بھی ہے۔ ان کے لیے مارچ، اپریل اور اگست، ستمبر کے مہینے بہترین ہوتے ہیں۔

اس کے لیے آپ ایسے پتّوں کا انتخاب کریں جو مکمل طور پر سرسبز ہوں، جو پتّے شاخوں سے گر جائیں یا خراب ہو رہے ہوں۔ اُن کا انتخاب بالکل نہ کریں۔ جو پودا اگانا مقصود ہو اس کا صرف ایک پتّہ لے کر کسی گملے یا ایسی بوتل میں رکھیں جو رنگین ہو۔ کیوں کہ رنگین بوتل میں سورج کی شعاعیں براہِ راست داخل نہیں ہوتیں۔ کچھ ہی عرصے میں آپ دیکھیں گے کہ صرف ایک پتّہ بڑھ کر مکمل پودے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

پھولوں کی آرائش :- پھولوں اور پودوں کو لوگ گھروں میں مختلف طریقوں سے اُگاتے اور سجاتے ہیں۔ پھولوں کی آرائش اور سجاوٹ کا انحصار گھر میں جگہ کی گنجائش پر ہے۔ مثلاً اگر کسی گھر میں بڑا سا صحن ہو تو وہ وہاں ایک خوبصورت سا باغیچہ بن سکتا ہے۔ اگر صحن چھوٹا ہو تو محض ایک مختصر سی کیاری پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ فلیٹوں میں رہنے والے بالکنیوں میں گملے رکھ کر اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں۔ بہرحال گھر چھوٹا ہو یا بڑا سجانے والے اپنے ذوق اور شوق کے مطابق پھولوں کی آرائش کے لیے جگہ نکال ہی لیتے ہیں۔

آئیے اب ہم آپ کو گھریلو باغبانی اور آرائش کے سلسلہ میں کچھ اہم باتیں بتاتے ہیں۔

۱۔ جب آپ بوتل میں کھاد اور مٹی ڈال کر ایک پودا لگائیں تو اُس مٹی کو صرف گیلا کر دینا ہی کافی ہوگا۔ بوتل میں بہت زیادہ پانی ڈالنا ضروری نہیں۔

۲۔ پودوں میں بہت زیادہ ٹھنڈا پانی نہیں ڈالنا چاہیئے۔

۳۔ گُلدان میں پھول لگاتے وقت اِس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ گُلدان کا رنگ پھولوں کے رنگ سے گہرا نہ ہو۔ اگر گلدان کا رنگ پھولوں کے رنگ پر غالب آجائے تو پھول لگانے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

۴۔ گلدانوں کو گھر میں مناسب جگہ پر رکھنا چاہیئے۔ مثلاً میزوں پر یا کونوں وغیرہ میں اور انھیں ایسی جگہ رکھیں جہاں وہ بچوں کی دست بُرد سے محفوظ ہوں اور گر کر ٹوٹنے کا خدشہ نہ ہو۔

۵۔ پھولوں کو ہمیشہ صبح سویرے یا سورج ڈوبنے کے بعد تراشیں۔ اِس طرح وہ جلد نہیں مُرجھاتے۔

۶۔ پھولوں کی ڈنڈیوں کو ترچھا تراشیں۔ اس طرح وہ زیادہ پانی جذب کرتے ہیں۔ اور دیر تک تازہ رہتے ہیں۔ ان ڈنڈیوں کو ہمیشہ تیز قینچی یا چاقو سے تراشیں۔ ہاتھ سے نہ توڑیں ورنہ وہ ٹوٹ جائیں گی۔

۷۔ گلدانوں کو آتشدان یا ہیٹر کے قریب نہ رکھیں۔

۸۔ پودوں کو ہمیشہ ایسی جگہ رکھیں جہاں دھوپ کا گزر نہ ہو۔ بالکل ٹھنڈے کمرے میں پودوں کو نہ رکھیں اور نہ ہی انھیں گرم جگہ سے ٹھنڈی جگہ پر ایک دم لے جائیں۔

۹۔ جو پودے مٹی کے گملوں میں لگائے جائیں انھیں صحن یا برآمدے میں رکھنا چاہیئے۔

۱۰۔ بڑے گملے جن میں بڑے پودے لگائے جائیں انھیں چھوٹے گملوں کی قطاروں اور سِروں پر رکھیں۔

۱۱۔ لٹکانے والے گملے ہلکے اور مضبوط ہونے چاہئیں۔ انھیں تار کی ٹوکریوں میں رکھنا چاہیئے۔ تاکہ بوقتِ ضرورت نکالا جاسکے

۱۲۔ لٹکانے والے گملے آمد و رفت میں مخل نہ ہوں اور نہ ہی فالتو پتّوں اور پانی دیتے وقت پانی کے گرنے سے فرش خراب ہو۔

۱۳۔ پودوں کو کھاد اور مٹی بالکل خشک ہونے سے پہلے پہلے پانی دے دینا چاہیئے۔ ورنہ اُن کے سوکھ جانے کا خدشہ ہوتا ہے

۱۴۔ پودوں میں لگانے کے لیے آپ جو بیج استعمال کریں انھیں ٹھنڈی اور خشک جگہ پر رکھیں۔

۱۵۔ چند مہینوں میں گملوں کی مٹی کو کسی چھڑی کے ذریعے اُلٹ پلٹ کرکے اُوپر کی مٹی کو نیچے اور نیچے کی مٹی کو اوپر کر لینا چاہیئے۔ اس طرح اوپر کی مٹی پھپھوندی لگنے سے محفوظ رہتی ہے۔

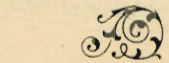

خالص دیسی گھی سے تیار کردہ

احمد

فریش ویل سوئیٹس

آپ کے اعلیٰ ذوق کی بھرپور تسکین کیلئے

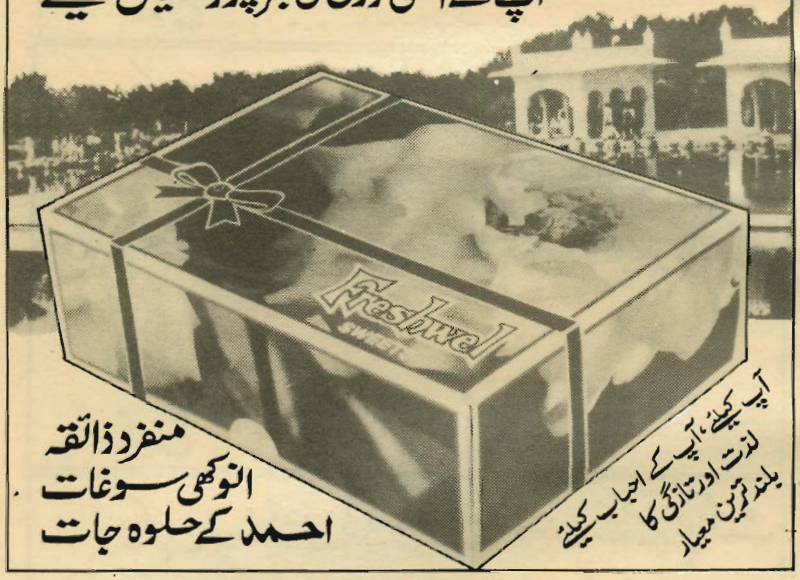

منفرد ذائقہ
انوکھی سوغات
احمد کے حلوہ جات

آپ کیلئے، آپ کے احباب کیلئے
لذت اور تازگی کا
بلند ترین معیار

صرف دو کلو مٹھائی

فریش ویل سوئیٹس کے کسی بھی سیلز پوائنٹ سے خریدیں اور پشت پر دیا گیا کوپن دے کر ایک پیکٹ احمد سویّاں مُفت حاصل کریں۔ یہ پیشکش صرف ۳۰ نومبر تک ہے

یہ کوپن اپنے قریبی **فریش ویل سوئیٹس** کے سیلز پوائنٹ پر لے جائیں اور ۲ کلو مٹھائی کی خریداری پر ایک پیکٹ **احمد** سویّاں **مُفت** حاصل کریں۔ یہ پیشکش صرف ۳۰ نومبر تک ہے

نام سیلز پوائنٹ _____

تاریخ _____

یہ کوپن اپنے قریبی **فریش ویل سوئیٹس** کے سیلز پوائنٹ پر لے جائیں اور ۲ کلو مٹھائی کی خریداری پر ایک پیکٹ **احمد** سویّاں **مُفت** حاصل کریں۔ یہ پیشکش صرف ۳۰ نومبر تک ہے

نام سیلز پوائنٹ _____

تاریخ _____

یہ کوپن اپنے قریبی **فریش ویل سوئیٹس** کے سیلز پوائنٹ پر لے جائیں اور ۲ کلو مٹھائی کی خریداری پر ایک پیکٹ **احمد** سویّاں **مُفت** حاصل کریں۔ یہ پیشکش صرف ۳۰ نومبر تک ہے

نام سیلز پوائنٹ _____

تاریخ _____

سیّد عبد العزیز عزمیؔ
تیسری قسط

نیا سلسلے وار ناول

پناہ

حنیف، یاسمین اور ناہید بہن بھائی تھے۔ ان کے ابّو رشید صاحب فوج میں میجر تھے اور وہ لوگ سرحد کے قریب ایک قصبے میں رہتے تھے۔ تینوں امّی سے اجازت لے کر سیر کے لیے باہر گئے اِدھر دُشمن فوجیوں نے قصبے پر حملہ کر دیا اور ان کے امّی ابّو کو قیدی بنا کر لے گئے۔ ان کے ابّو کے ایک کپتان دوست نے تینوں کو ان کے رشتے کے چچا چچی کے پاس بھجوا دیا لیکن چچا چچی ان کا خیال رکھنے کے بجائے ان کے ساتھ نوکروں کا سا سلوک کرتے اور مارتے پیٹتے۔ وہیں ان کی ملاقات علی سے ہوئی وہ بھی ان کی طرح اپنے خالو کے ظلم کا شکار تھا ایک دن چاروں نے پروگرام بنایا کہ وہ پہاڑی کے اُس پار جزیرے میں رہنے جائیں گے۔
یہ فیصلہ کر کے وہ ایک دن جزیرہ دیکھنے گئے۔ جزیرہ دیکھ کر چاروں بہت خوش ہوئے اور یہ اندازہ لگا کر واپس آ گئے کہ وہاں کن کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ واپس آکر چاروں مختلف چیزیں جمع کرتے رہے اور ایک دن موقع پا کر سارے سامان سمیت علی کی کشتی میں جزیرے جا پہنچے۔

"بھئی میرے خیال میں تو ہمیں رات کو سونے کے لیے کوئی گھنا سا درخت تلاش کرنا چاہیئے" علی نے کہا "بس اُسی کے نیچے بستر بچھا کر لیٹ جائیں گے کیونکہ اگر بارش بھی آگئی تو ہم محفوظ رہیں گے"

"وہ سامنے دو درخت ہمارے مطلب کے ہیں۔ اگر ہم ان کے نیچے بستر بچھالیں تو کیسا رہے گا" حنیف نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ جگہ تو اچھی خاصی ہے آؤ چل کر دیکھیں" علی نے کہا اور وہ لوگ دیکھنے کے لیے آگے بڑھ گئے۔ واقعی وہ جگہ مناسب تھی، بڑ کے گھنے درختوں کی شاخوں نے آپس میں گتھم گتھا ہو کر ایک چھتری سی تان دی تھی "ہم یہاں ہی بستر لگائیں گے۔ قدرتی چھتری کا سایہ بھی رہے گا" علی نے اپنا فیصلہ سُناتے ہوئے کہا۔ "اُف ناہید باجی ہمارا یہ بستر کتنا آرام دہ بنے گا" یاسمین بولی۔ علی نے جلدی سے کہا "چلو اب پہاڑی کے دوسری طرف چلیں اور سوکھی گھاس لا کر یہاں بچھا دیں"

چاروں بچے خوشی خوشی وہاں چل دیئے۔ جہاں انہیں سوکھی ہوئی گھاس نظر آرہی تھی۔ وہ گھاس کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر بنا دیتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔ تھوڑی دیر میں بہت سی گھاس جمع ہو گئی۔ انھوں نے اُٹھا کر بڑ کے درخت کے نیچے رکھ دی۔ چاروں بچے اپنے بستر بنانے میں مگن تھے۔

"تاروں بھری رات میں گھاس کے بستر پر سونے میں کتنا مزا آئے گا" ناہید خوشی سے بولی۔

"بستر تو بن گئے" علی بولا "مگر ہمیں رات سے پہلے پہلے اپنا سامان محفوظ جگہ پر رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ آندھی کا خطرہ ہے" لیکن بچوں کو اب پھر بھوک لگنے لگی تھی۔ انھوں نے ایک ایک گاجر اور علی کے ڈبے سے تھوڑی سی مٹھائی کھائی۔ "رات کے کھانے پر بھی کچھ مل سکتا ہے یا نہیں" حنیف نے پوچھا۔ اُسے آج رہ رہ کر بھوک لگ رہی تھی۔

"ہاں! چائے کا ایک ایک پیالہ مل سکتا ہے اور اس کے ساتھ مکئی کا ایک بھُٹا بھی مل سکتا ہے" ناہید نے جواب دیا "دیکھو بھئی ہمیں یوں جلدی جلدی کھا کر اپنے کھانے پینے کی اشیاء کو کم نہیں کرنا چاہیئے۔ ورنہ ہم بھوکے مر جائیں گے میرا خیال ہے کہ کل مچھلی کا شکار بھی کرنا چاہیئے" علی نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اور ویسے بھی ہمیں کل اپنا گھر بھی تو بنانا ہے" حنیف نے کہا "ہاں۔ چلو لڑکیوں تم دونوں چشمے سے پانی بھر لاؤ۔ میں اور حنیف جب تک سامان رکھنے کے لیے جگہ تلاش کرتے ہیں" علی نے کہا۔ پھر دونوں لڑکیاں کیتلی اور دیگچی لے کر چشمے کی جانب بڑھ گئیں۔ اور دونوں لڑکے ساحل کی طرف چلے گئے۔ ساحل کے دائیں طرف ایک پیپل کا پُرانا درخت تھا۔ بارش کا پانی اس کی جڑوں کی مٹی بہا کر لے گیا تھا۔ لہٰذا اس کی جڑوں کے نیچے ایک غار سا بن گیا تھا۔

"دیکھو حنیف" علی خوشی سے بولا "یہ سامان رکھنے کی نہایت عمدہ جگہ ہے۔ ارے ناہید اور یاسمین تم بھی آ کر دیکھو کتنی اچھی جگہ ہمیں ملی ہے" دونوں لڑکیاں بھی بھاگ کر آگئیں "ارے یہ تو بالکل الماری جیسا بن گیا ہے۔ ہم اس میں

اپنا سامان رکھ سکتے ہیں، یہاں یہ بالکل محفوظ رہے گا۔" دونوں نے کہا

"ہم ترپال کے نیچے تمام سامان رکھیں گے۔ چلو تم دونوں اس کی صفائی وغیرہ کرو۔ جب تک ہم پانی بھر لیتے ہیں۔" علی نے یہ کہا اور دیگچی اور کیتلی حنیف نے سنبھالی اور دونوں چشمے کی طرف چل دیے "ہمیں کوئی اور چشمہ بھی تلاش کرنا چاہیئے۔" علی بولا" تاکہ اگر کبھی ہمیں غاروں میں چھپنا پڑے تو ہمارے کام آئے۔"

پانی بھر کر جب وہ واپس آئے تو اس وقت تک دونوں لڑکیوں نے جگہ کی صفائی کر لی تھی۔ چاروں بچّوں نے مل کر اپنا سامان لاکر اس قدرتی جگہ پر رکھ دیا اور اس کے اوپر ترپال بھی رکھ دی۔ اب وہ مطمئن تھے۔ علی نے کہا۔" آؤ ذرا پہاڑ پر ہو آئیں۔ کہ کہیں ہمیں کوئی ڈھونڈنے تو نہیں آرہا ہے" وہ چاروں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے۔ مگر انھیں وہاں چاروں طرف کوئی آدمی دُور دُور تک نظر نہیں آیا۔ جھیل کا پانی چاروں طرف نہایت سُکون سے بہہ رہا تھا۔ کہیں کہیں ابابیلیں اور فاختائیں اُڑتی دِکھائی دے رہی تھیں۔ "شکر ہے کہ ہم محفوظ ہیں۔ کوئی بھی اِدھر نہیں آسکتا۔" یاسمین خوشی بھرے لہجے میں بولی۔ "نہیں اگر ہمیں اس جزیرے پر رہنا ہے تو ہمیں خود کو ہر لمحے غیر محفوظ سمجھنا ہوگا۔ ورنہ اگر ہم اپنی حفاظت سے غافل ہوئے تو پکڑے جائیں گے"۔ علی سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو علی" حنیف نے ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر یہ لوگ نیچے چلے آئے "ہمیں یہ سامان ایک بار پھر اُٹھانا پڑے گا جب ہمارا گھر مکمل ہو جائے گا" علی بولا "مگر ہمارا گھر کہاں بنے گا"؟۔

علی ان تینوں کو ساحل کی مغربی سمت لے گیا، جہاں بید کے درختوں کا گھنا جھُنڈ تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے جھُنڈ میں اندر جانے کا راستہ بنایا۔ اب وہ چاروں جھُنڈ کے درمیان میں کھڑے تھے۔ جہاں ایک بڑے کمرے کی مانند خالی اور ہموار جگہ تھی۔

"یہاں بنے گا ہمارا گھر" علی بولا کسی کے دماغ میں بھی نہیں آئے گا کہ ہمارا گھر یہاں ہو سکتا ہے اور ہم یہاں چھُپے ہوئے ہیں"۔ "ہاں اگر کوئی ہمیں ڈھونڈتے ہوئے جزیرے پر پہنچ جائے تو پھر بھی وہ ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ کیونکہ ہم جس جھُنڈ سے گھُس کر آئے ہیں وہ بڑا تنگ ہے۔ جہاں سے ہم بھی بڑی مشکل سے نکلے ہیں۔ بڑا آدمی تو نہیں نکل پائے گا" حنیف نے کہا

وہ کافی دیر تک اپنے گھر کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ واپس ساحل پر لوٹ آئے۔ اب وہ چائے بنانے اور بھُٹّے بھوننے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ حنیف اور علی نے سوکھی ہوئی ٹہنیوں کو اِکٹّھا کر کے دیا سلائی دِکھائی اور آگ جلنے لگی۔ اب سُورج ڈوب رہا تھا۔ ہلکا ہلکا سرمئی رنگ کا اندھیرا اب چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ علی کو افسوس ہو رہا تھا کہ سورج کی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنا آتشی شیشہ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ آخر کیتلی کھولنے لگی، ناہید نے کپڑے کی مدد سے اُسے اتارا اور پھر اچانک بولی۔ "ارے دُودھ تو ہے ہی نہیں۔ اب کیا ہوگا۔"

"چلو چینی تو ہوگی، بس ایسے ہی پی لیں گے۔" علی نے کہا مگر وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ اب ہمیں دودھ کا بھی بندوبست کرنا ہوگا۔ ورنہ روز روز بغیر دُودھ کی چائے نقصان پہنچائے گی۔" چائے کے بعد آگ پر بھُٹّے رکھ دیے گئے۔

آخر چائے اور بھٹے بھی تیار ہو گئے۔ ناہید نے گلاسوں میں اِن کے لیے چائے نکال دی اور وہ چاروں اب چائے بھی پی رہے تھے اور بھٹے بھی کھا رہے تھے۔ اُن کے دل خوشی سے لبریز تھے، وہ اب آزاد تھے، وہ اس جزیرے کے بھی تشکر گزار تھے کہ جس نے انھیں پناہ دی۔ چائے تو بغیر دُودھ کے تھی مگر پھر بھی انھیں بُری نہیں لگ رہی تھی، علی نے آگ بُجھانی شروع کر دی اور بولا "اندھیرے میں آگ بہت دُور سے نظر آجاتی ہے۔ اگر کوئی اس آگ کو دیکھ کر یہاں آنکلا تو... ویسے بھی اب ہماری تلاش میں لوگ اِدھر اُدھر پھر رہے ہوں گے۔ چلو اب ہمیں سو جانا چاہیئے۔ کل ہمیں بڑی محنت کا کام کرنا ہے"

ناہید نے برتن دھوئے اور انھیں اپنی مقرر جگہ پر رکھا۔ پھر یہ لوگ اپنے اپنے بستروں کی طرف چل دیئے۔ اَب جزیرے پر رات اپنے بازو پھیلا رہی تھی۔

"آج جزیرے میں ہماری آزادی کی پہلی رات ہے۔ ہم چاروں یہاں اکیلے ہیں، مگر ہم پھر بھی خوش ہیں بیحد خوش!" حنیف نے کہا اور چاروں بچّوں نے سر ہلا دیئے۔

چاروں بچّوں نے اب اپنے جُوتے اتارے اور اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ حنیف نے پرانی دَری لڑکیوں کو لا کر دے دی۔ تاکہ سردی لگے تو وہ اوڑھ لیں۔

"تم لوگوں کو ڈر تو نہیں لگ رہا" حنیف نے لڑکیوں سے پوچھا۔

"نہیں ...! آپ لوگ جو موجود ہیں" یاسمین ہنس کر بولی۔

ناہید اور یاسمین تو لیٹتے ہی سو گئیں مگر دونوں لڑکے ابھی تک جاگ رہے تھے۔ وہ جانوروں کی آوازیں سُن رہے تھے۔ خرگوش، اُلّو، فاختہ، مینڈک وغیرہ۔ جھیل کی طرف سے جھینگر بھی مُسلسل بول رہے تھے۔

"علی تم کتنے اچھّے ہو، مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے۔ تم ہمیں اس جزیرے پر لے آئے ہو جس کا صرف تمھیں پتہ تھا۔ جب میں یاسمین اور ناہید کو چچی کے ہاتھوں پٹتا دیکھتا تو میں سوچتا تھا کہ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم مر جائیں" مگر تم نے ہمیں بچا لیا" حنیف رُندھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ارے حنیف میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے، میں بھی تو اکیلا تھا۔ تم نے مجھے سہارا دیا۔ تم نہ ہوتے تو میں بھی اس جزیرے میں اکیلے نہیں آسکتا تھا اور ہاں مجھے اُمید ہے کہ تمھارے امّی ابّو ضرور آئیں گے اور ایک روز تم یقیناً اپنے گھر واپس جاؤ گے۔ انشاءاللہ۔ علی نے جواب دیا۔ پھر یہ دونوں خاموش آنکھیں بند کیے لیٹے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ میٹھی نیند سو رہے تھے۔

جزیرے میں ان کی پہلی رات کی پہلی صبح ہو رہی تھی۔ سب سے پہلے علی کی آنکھ کھلی، اُس نے حنیف کو ہلایا۔!

"اٹھو حنیف دِن چڑھ آیا ہے" حنیف بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پہلے تو اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر جلد ہی آنکھیں گرد و پیش کے ماحول سے مانوس ہوئیں تو وہ مُسکرایا۔ اب یہ دونوں لڑکیوں کے بستر کی طرف آئے، دونوں سو رہی تھیں، اُٹھایا، تو دونوں بہنیں آنکھیں ملتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

"ایسا کرتے ہیں پہلے ہم جھیل میں نہالیں، اس طرح ہماری سُستی بھی دُور ہو جائے گی" علی نے مشورہ دیا۔ پھر چاروں بچے جھیل میں نہائے، اس طرح وہ تازہ دَم ہو گئے، ان کے پاس کوئی تولیہ نہ تھا، انھوں نے ایک پُرانے کپڑے سے بدن پُونچھا، پھر وہ ناشتے کے انتظام میں لگ گئے۔ علی نے جھیل پر پہنچ کر مچھلی پکڑنے کا کانٹا لگا دیا تھا۔ لہٰذا وہ جب نہا کر باہر آئے تو اُس وقت تک دو مچھلیاں اُس میں پھنس چکی تھیں، ناہید نے سب سے پہلے سوکھی لکڑیوں کو جمع کر کے آگ جلائی اور کیتلی میں چائے چڑھا دی۔ علی نے اتنی دیر میں مچھلیاں صاف کر لیں۔ یاسمین نے جلدی سے لکڑیوں کا دُوسرا ڈھیر جلا دیا۔ علی نے وہاں مچھلیاں تلنی شروع کر دیں، جتنی دیر میں مچھلیاں تلی گئیں۔ اتنی دیر میں چائے بھی تیار ہو گئی تھی۔ "ارے ہمارے پاس دُودھ تو ہے نہیں" یاسمین چلّائی۔

"تو کیا ہوا۔۔؟ ہم بغیر دُودھ کے چائے پی لیں گے" علی نے جواب دیا۔

"مگر اس کا بھی کچھ بندوبست کرنا پڑے گا" حنیف نے سوچتے ہوئے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ہمیں صرف گھر بنانے کے لیے سوچنا چاہیئے" علی نے حنیف کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "چلو یاسمین تم ناہید کے ساتھ مل کر برتن دھوؤ اور حنیف تم آگ بجھا دو، پھر ہم سب گھر بنانے کے لیئے جگہ دیکھیں گے۔۔۔"

"اِس وقت تو گاؤں میں ہمارے فرار ہونے کے چرچے ہو رہے ہوں گے" ناہید بولی۔

"ہاں سب لوگ ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے" علی نے مسکرا کر کہا۔

جلد ہی وہ چاروں درختوں کے جُھنڈ میں سے گزر کر درمیان کی خالی جگہ پر پہنچ گئے۔ علی نے کہا۔ "بھئی میرے ذہن میں گھر بنانے کی ترکیب یہ ہے کہ یہ جو بید کے درختوں کی لمبی لمبی پتلی پتلی شاخیں ہیں۔ ایک یہاں ایک وہاں، میرا خیال ہے کہ اگر ہم ان شاخوں کو پکڑ کر جھکائیں تو شاخیں درمیان سے آپس میں مل جائیں گی۔ ہم انھیں رسّی سے باندھ دیں گے یا ایک دوسرے میں پھنسا دیں گے۔ اس طرح شاخوں کی چھت سی بن جائے گی۔ کلہاڑی کی مدد سے ہم کچھ اور درختوں کو گرا لیں گے۔ اور ان کے تنوں اور شاخوں سے دیواریں بنا لیں گے۔ جن بید کے درختوں کو ہم چھت کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ ان کے گرد ہم یہ شاخیں اور تنے گاڑ دیں گے۔ جہاں کہیں خلا رہ جائے گا۔ وہاں پہ ہم

یہ تنے اور شاخیں گاڑ دیں گے اور پھر گھاس پھونس سے سوراخ بند کر دیں گے۔ یوں ایک خاصا بڑا گھر بن جائے گا۔ لکڑی کی دیواریں ہوں گی پتوں کی چھت ہوگی۔ کیا خیال ہے تم لوگوں کا؟"۔

تینوں بچے حیرانگی سے مُنہ کھولے علی کی ترکیب سُن رہے تھے۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ کہیں ایسا بھی گھر بن سکتا ہے، اور اتنی آسانی سے بن سکتا ہے۔ انھیں یاد تھا کہ جب ان کے ابّو نے گھر کی صرف مرمّت کروائی تھی تو دو مہینے لگ گئے تھے۔

"ٹھیک ہے ہمیں تمھاری اسکیم پسند آئی ہے تم ضرور ایسا کرو" تینوں بچے ایک ساتھ بولے۔

"ٹھیک ہے میں ایک درخت کی شاخ نیچے کرتا ہوں تم لوگ اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا۔ اسی طرح میں دوسری شاخ نیچے کروں گا۔ جب چھ سات شاخیں نیچے ہو جائیں تو ان کو آپس میں رسّی سے باندھ دینا۔ جب ان سب درختوں کی شاخیں نیچے ہو جائیں گی تو چھت مکمل ہو جائے گی۔ جو شاخ زیادہ نکلی ہوئی ہوگی وہ ہم کاٹ دیں گے۔ ٹھیک ہے اب میں اوپر چڑھتا ہوں"۔

یہ کہہ کر علی پھُرتی سے اُوپر چڑھ گیا۔ تینوں بچّوں کے دِل جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر مکمل کرنا چاہتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے علی نے ایک درخت کی شاخ اپنے وزن سے نیچے جُھکائی۔ حنیف نے اُسے پکڑ لیا۔ پھر علی نے دوسری شاخ نیچے جُھکائی۔ یاسمین نے اس شاخ کو پکڑ لیا۔ ناہید دوڑ کر رسّی اُٹھا لائی۔ حنیف نے نیچے سے سب شاخوں کو مضبوطی سے باندھ دیا۔ علی بھی نیچے اُتر کر حنیف کی مدد کرنے لگا۔ دونوں نے کلہاڑی اور ایک لمبے شکاری چاقو کی مدد سے شاخوں کے زائد حصّے کاٹ دیئے۔ اَب کچھ کچھ چھت کی شکل واضح نظر آ رہی تھی۔ کام کرتے کرتے صبح سے دوپہر ہو گئی۔ بچّوں کو ابھی تک بھوک کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ بس جلدی جلدی اپنا گھر مکمل کرنا چاہتے تھے۔ آخر علی کو کام روکنا پڑا۔ "بھئی اب ہمیں کچھ کھا پی لینا چاہیئے۔ ورنہ ایسے تو ہم تھک جائیں گے"۔ علی کے یاد دلاتے ہی باقی بچّوں کو بھی بھوک کا خیال آ گیا۔ حنیف پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا "بھئی میرے پیٹ میں تو چوہے کیا پُورا چڑیا گھر گھوم رہا ہے"۔

وہ لوگ واپس جھیل کی طرف آئے اور ہاتھ مُنہ دھونے لگے۔ پھر کھانے پینے کے انتظام میں لگ گئے۔ "ناہید تم۔ صرف چار انڈے نکال لو" علی نے کہا "اور کچھ آلو اُبال لو۔ ہم ایک ایک گاجر بھی کھائیں گے۔ اور پھر بعد میں مٹھائی کا ایک ایک ٹکڑا"۔

مٹھائی کا نام سُن کر حنیف کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔۔۔ آہا ہا ہا۔۔!! پھر وہ دل ہی دل میں کہنے لگا "چچا جی کے ہاں تو ہم مٹھائی کو ترس ہی گئے تھے"۔

ناہید نے تھوڑی دیر میں آلو اُبال لیے۔ دونوں لڑکوں نے ذرا سی دیر میں آلوؤں پر سے چھلکا اتار دیا۔ یاسمین نے دسترخوان بچھایا۔ اِدھر انڈے بھی اُبل گئے۔ ناہید نے آلوؤں کا بھُرتہ بنا دیا۔ علی بولا حنیف تم اُسی چشمے سے پانی بھر لاؤ۔"

حنیف جگ لے کر پانی بھر لایا، پھر وہ چاروں دسترخوان کے گرد بیٹھ گئے اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کر دیا "ہمارا کھانا کتنا سادہ اور پُر لطف ہے" حنیف بولا۔

"مگر یہ قدرے بے ڈھنگا بھی ہے۔ کیوں کہ ہم ایک ہی چیز مُسلسل نہیں کھا سکتے۔ ہمیں روٹی اور چاول کی بھی ضرورت ہوگی" علی نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

"مگر ہمیں مچھلیوں کی تو قلّت نہیں۔ ہم مچھلی کھا کر اپنے مُنہ کا ذائقہ بدل سکتے ہیں" حنیف نے گاجر کھاتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر شاید ہمیں یہاں مستقل رہنا ہے اور ہمارا یہ راشن صرف چند دن اور ہمارا ساتھ دے سکتا ہے" ناہید نے فکر مندی سے کہا، کیوں کہ اُسے خانہ داری کا اندازہ تھا۔

"مجھے بھی اس کی فکر ہے" علی نے کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے کبھی کبھی گاؤں جا کر خوراک لانی پڑے گی"

"کیا کہا آپ واپس گاؤں خوراک لینے جائیں گے" یاسمین گھبرا کر بولی۔

"ہاں۔! ورنہ تو ہم یہاں بھوکوں مر جائیں گے" علی نے سمجھاتے ہوئے کہا "دیکھو میں اپنے خالو کے کھیت سے سبزیاں لا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ آلو بھی مل جائیں گے۔ مُرغیوں کے دڑبے سے انڈے بھی مل سکتے ہیں۔ کچھ مُرغیاں تو میری اپنی ذاتی ہیں اور ہاں ایک میری گائے بھی ہے۔ ابھی وہ چھوٹی تھی کہ اُس کی ماں مر گئی تھی۔ میں نے اُسے پالا ہے اور اُس کا نام میں نے ..." علی بولتے بولتے رُک گیا۔

"ہاں کیا نام رکھا ہے تم نے" تینوں بچّے یک زبان ہو کر بولے۔

"وہ ... ریشم رکھا ہے" علی جھجکتے ہوئے بولا۔

"ریشم۔! مگر یہ نام تو اچھا ہے۔ تم خواہ مخواہ شرمندہ ہونے لگے۔" حنیف ہنستے ہوئے بولا۔

"کاش ہمارے پاس چند مُرغیاں اور گائے ہوتی تو ہم روز انڈے کھاتے اور چائے بھی دُودھ والی ہوتی ..." یاسمین بولی ...

"پاگل ہو تم۔ بھلا مُرغیاں اور گائے یہاں کیسے آسکتی ہیں۔! ہاں البتہ علی سبزیاں اور انڈے وغیرہ گاؤں جا کر لا سکتا ہے" حنیف ہنستے ہوئے بولا۔

"نہیں اگر علی بھائی کو کسی نے پکڑ لیا تو ہم یہاں اکیلے نہیں رہ سکتے" یاسمین نے گھبرا کر کہا۔

"خیر یہ بعد کا مسئلہ ہے۔ ابھی کھانا کھا کر ہمیں اپنا گھر بھی بنانا ہے" علی نے ہاتھ اُٹھا کر کہا گویا یہ بحث ختم کرنے کا اعلان تھا۔

علی اور حنیف تو واپس اپنا گھر بنانے چل دیئے۔ جب کہ ناہید اور یاسمین برتن دھونے لگیں۔

علی اور حنیف کام میں لگے ہوئے تھے۔ علی اپنی کلہاڑی کے ذریعے بید کے پتلے پتلے درخت کاٹ رہا تھا۔ اُس نے کئی درختوں کی سیدھی شاخیں بھی کاٹ دی تھیں۔ حنیف کے لائے ہوئے اوزاروں کے تھیلے میں ایک پرانا بیلچہ تھا۔ وہ زمین میں گڑھے کھود کر اُن میں شاخیں اور درخت کے تنے گاڑ رہا تھا۔ پھر ناہید اور یاسمین بھی اپنا کام نمٹا کر آ گئیں۔ اب وہ چاقو کی مدد سے شاخوں کی ٹہنیوں کو کاٹ اور تنوں کو ہموار کر رہی تھیں۔ سورج ڈھلنے لگا۔ وہ کافی دیر سے کام کر رہے تھے۔ وہ پسینے میں نہا گئے۔ لیکن کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ گھر کی چھت مکمل ہو چکی تھی اور ایک طرف کی دیواریں بھی مکمل ہو گئیں۔ اب بچّوں کو اپنے گھر کی تصویر واضح نظر آنے لگی تھی کہ وہ بن کر کیسا لگے گا وہ خوش تھے کہ ان کا گھر بڑا اور مضبوط بنے گا۔ ان کے ننّھے مُنّے دل فخر سے لبریز تھے کہ یہ گھر اُن کے اپنے ہاتھوں سے بن رہا تھا۔

"چلو اب کام ختم کریں۔ اب میں دیکھوں کہ میرے کانٹے میں کوئی مچھلی پھنسی کہ نہیں" علی نے کہا۔

مگر افسوس رات کے لیے کوئی مچھلی ہاتھ نہ آ سکی۔ "یہ خوراک کا مسئلہ ہمیں پریشان کرے گا" علی فکر مند ہو کر بولا "پینے کا پانی ہمارے پاس وافر ہے۔ مگر خوراک کا کیا بنے گا۔ کہیں ہم بھوکوں نہ مر جائیں"

"کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مگر مجھے فکر ہے کہ دُودھ کا کیا بنے گا؟" حنیف بولا۔

"ہاں اب میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے اپنی گائے ریشم اور مُرغیاں یہاں لانی ہی پڑیں گی۔ انڈے بھی ضروری ہیں۔ اور مجھے تو انڈے بے حد پسند بھی ہیں"

"مگر جزیرے پر گائے اور مُرغیاں لانا تو ناممکن ہے۔ ہاں البتہ سبزیاں اور انڈے لائے جا سکتے ہیں" حنیف نے کہا "ٹھیک ہے۔ کل دیکھیں گے۔ اب ہمیں سو جانا چاہیئے۔ تاکہ صبح گھر بنانے کے لیے تازہ دم رہیں ــــ"

کھانے کے بعد سب بچّے اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے، ہی لہٰذا لیٹتے ہی سو گئے۔

اگلے دن ناشتے کے بعد وہ پھر جھنڈ میں گھس گئے۔ علی نے صبح ہی دو مچھلیاں پکڑ لی تھیں۔ اور ناشتے میں آج پھر بغیر دُودھ کی چائے تھی۔ وہ اپنے راشن کی طرف سے بہت فکر مند تھے۔ آلو بہت تھے مگر باقی چیزیں کم

پڑتی جا رہی تھیں۔ علی نے سوچا تھا کہ آج رات وہ ضرور کشتی لے کر گاؤں جائے گا۔ اور کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آئے گا۔

دوپہر تک بچوں نے خوب کام کیا۔ آخر دو گھنٹے کی سخت محنت کے بعد گھر مکمل ہو گیا۔ "اب صرف دروازے کی ضرورت ہے۔ سامنے کی خالی جگہ ہم دروازہ بنالیں گے۔ لمبی لمبی شاخیں جوڑ کر باریک باریک ٹہنیوں کو آپس میں ملا کر ہم پھاٹک بنالیں گے۔ پھر کسی کنڈی کے ساتھ پھاٹک کو اس طرح جوڑیں گے کہ یہ کھل بھی جائے اور بند بھی ہو جائے۔

"مگر ہمیں دروازے کی بہت زیادہ ضرورت بھی تو نہیں" حنیف بولا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں گھر کی دیواروں پر پلاسٹر وغیرہ کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے، سردی کے وقت ہم غاروں میں چلے جائیں گے اور گرمیوں میں اس گھر میں آجایا کریں گے۔ اور ویسے بھی ہمارا یہ گھر خود بخود بڑھے گا اور اس کی ٹہنیوں اور شاخوں پر نئی کونپلیں جب آئیں گی تو درمیان کا خلا خود بخود بند ہو جائے گا۔"

"واہ ہمیں اس زندہ گھر میں رہ کر تو بڑا لطف آئے گا۔" حنیف نے کہا۔

"مگر کاش کھانے کی چیزیں ہمارے پاس زیادہ ہوتیں تو اس زندہ گھر میں رہنے کا مزہ دوبالا ہو جاتا۔!" ناہید نے حسرت سے کہا۔

"فکر مت کرو۔! میں کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کروں گا۔!"

انھوں نے دوپہر کے کھانے میں خوبانیاں، بھٹے، آڑو اور سیب کھائے یہ انھوں نے اسی جزیرے کے درختوں سے توڑے تھے۔ شام کو ناہید نے آلوؤں والی کھچڑی بنائی۔

اب ان کے پاس صرف تھوڑا سا آٹا اور چاول بچے تھے۔! باقی چیزیں قریب قریب ختم تھیں۔ آٹے کے ساتھ تو یہ مسئلہ تھا کہ توا نہیں تھا۔ لہٰذا روٹی نہیں پک سکتی تھی۔

رات کھانے کے بعد علی بولا۔ اب میں گاؤں جا رہا ہوں۔ آج رات کو ہلکی ہلکی آگ کی روشنی رکھنا۔ راتیں اندھیری ہیں۔ میں آگ کی مدد سے واپسی کا راستہ تلاش کر لوں گا۔

پھر اس نے کشتی نکالی اور جھیل میں ڈال دی۔ حنیف نے کہا۔ "دیکھو علی بھائی۔ ذرا احتیاط سے جانا اور اگر خطرہ ہو تو چیزیں چھوڑ کر واپس آجانا۔"

"ٹھیک ہے ۔۔۔" علی نے جواب دیا اور کشتی آہستہ آہستہ کنارے سے دور ہو گئی۔

کیا علی گاؤں پہنچ گیا؟؟؟ _____ وہاں اس پر کیا بیتی؟؟؟

یہ سب اگلی قسط میں پڑھیے۔

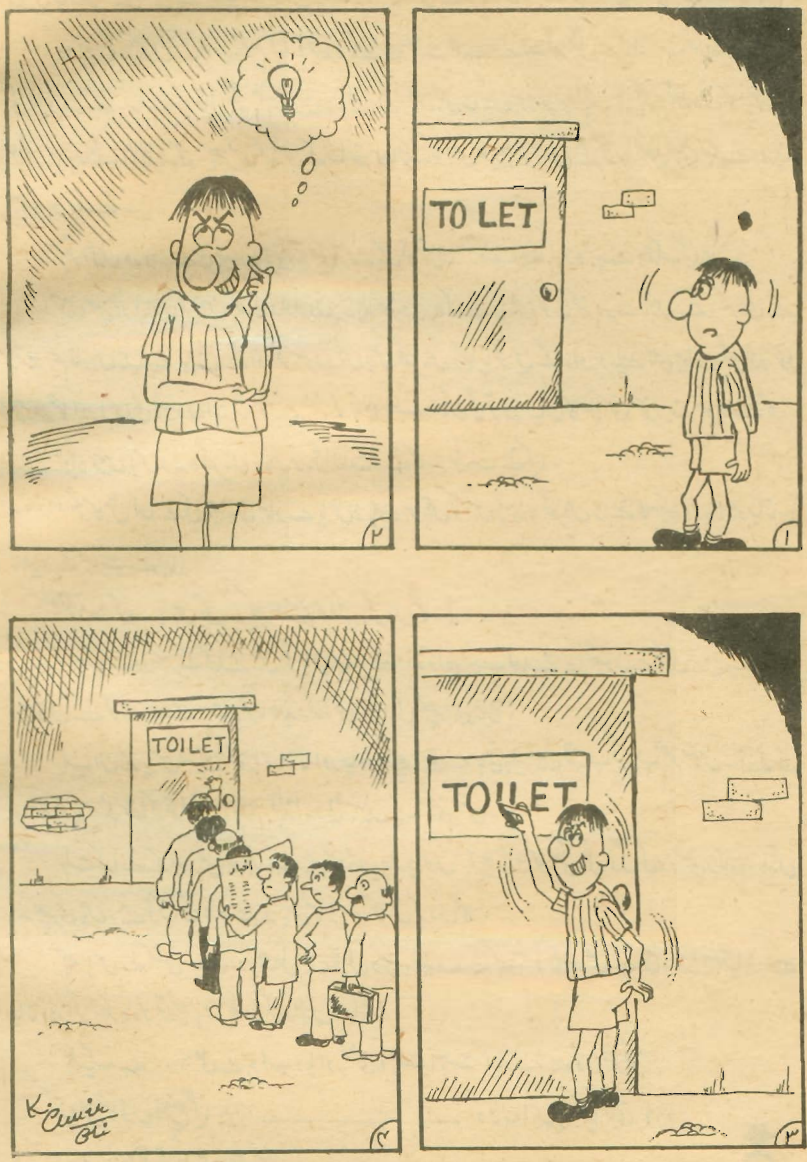
TO LET
TOILET
TOILET

افغانستان کے پس منظر میں لکھا ہوا سلسلہ وار ناول

ایف ملک سلیم
پانچویں قسط

پاسبان

میں دوسرے افغان مجاہدین کے ساتھ ایک کیمپ میں قید تھا۔ جورگن نام کا ایک فوجی مجھ سے یہ راز معلوم کرنے آیا کہ جلال آباد کا پُل کس نے تباہ کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے مجھ پر اتنا تشدد کیا کہ میں بے ہوش ہوگیا۔ دوسری جانب کے جی بی کا ایک ایجنٹ راک آرکنڈ افغان مجاہدین کی سرکوبی کے لیے قندھار پہنچ چکا تھا۔ اُسے ابلال، ارفع اور ارمغان کی تصویریں دکھائی گئیں۔ یہ تینوں روسیوں کے لیے درد سر بنے ہوئے تھے۔ ایک روسی فوجی ایڈرک مذہب اسلام قبول کرکے مجاہدین کا ساتھ دے رہا تھا۔ راک آرکنڈ کو اس پر شک ہوا اور اُس نے اُسے گولی ماردی۔ وہاں جب میں ہوش میں آیا تو جورگن میرے سر پر بدستور موجود تھا۔ دوسری طرف ابلال، ارفع اور ارمغان نے فیصلہ کیا کہ ایڈرک کی موت کا بدلہ لیا جائے گا۔ اگلے دن کوڑے کے ڈرم سے ایڈرک کی مسخ شدہ لاش ملی اور تمام اخباروں میں شہ سُرخیوں کے ساتھ یہ خبر چھپی۔ ادھر اسپتال میں ایک ڈاکٹر کی مدد سے جو میرا ہمدرد بن گیا تھا، میں فرار ہونے والا تھا کہ یکایک جورگن آموجود ہوا، لیکن میں اُسے جُل دے کر بھاگ نکلا۔ روسی جاسوس کتوں کے ساتھ میری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، لیکن میں بحفاظت اپنے ٹھکانے تک جا پہنچا۔ ابلال، ارفع اور ارمغان، راک کو قتل کرنے کے لیے چھپ کر اس کے کمرے میں داخل ہوئے مگر راک ان کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا اور اُس نے عہد کیا کہ وہ روسیوں کے خلاف جدّ و جہد میں مجاہدین کا ساتھ دے گا۔ اس کا نام حبیب بجر رکھا گیا۔ ہم پانچوں مل کر مجاہدین کے سب سے بڑے دشمن وائزمین کو ٹھکانے لگانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور حبیب بجر نے اطلاع دی کہ مکان کو چاروں طرف سے گھیرا جاچکا ہے۔ میں نے حواس برقرار رکھتے ہوئے باہر موجود ارفع اور ارمغان کو ٹارچ کے ذریعے سگنل دیا۔ کچھ ہی دیر میں انھوں نے باہر سے اور ہم نے اندر سے روسی فوجیوں پر حملہ کردیا۔ بہت جلد میدان صاف ہوگیا اور ہم وہاں سے بحفاظت نکل آئے۔ پھر منصوبے کے مطابق ہم رات کی تاریکی میں تمام محافظوں کو زہریلی گیس کے ذریعے ٹھکانے لگا کر ماشیر تک جا پہنچے۔ ہ وہ دیکھ کر وہ شدید خوفزدہ ہوگیا۔ ہم نے اُسے ٹیبل پر رکھا دُودھ پینے کی ہدایت کی۔ جب وہ دُودھ پی گیا تو یہ سُن کر اُس کی حالت غیر ہوگئی کہ اس میں زہر تھا۔ ہم نے اس سے سارے کاغذات اور اہم فائلیں حاصل کیں اور ایک شیشی زمین پر پھینک کر کہا کہ اسے چاٹ کر اپنی جان بچالو۔ جب وہ زمین پر بکھری دوا کُتّے کی طرح چاٹ گیا تو میں اس کے قریب آکر بولا: "زہر یہ تھا جو تم نے چاٹا۔"

اب آپ آگے پڑھیں

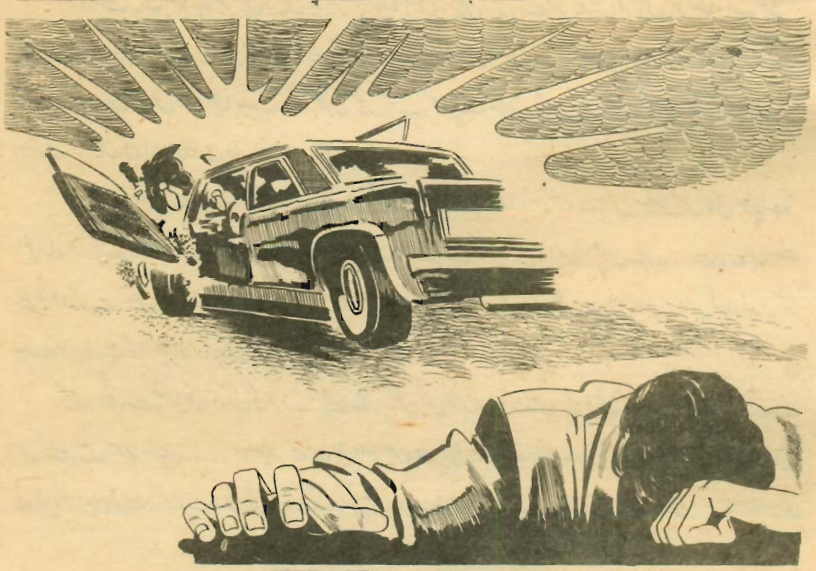

"نہیں ماشیر کا جسم کانپ اٹھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا مگر لرزتے ہوئے قدم اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھے۔

"تم... تم غلط کہہ رہے ہو... میں.... میں نہیں مان سکتا" اس کے بے قابو ہونٹوں سے آواز نکلی۔ "نہیں یہ حقیقت ہے ماشیر... تمہاری موت کا وقت آن پہنچا" میں نے قریب جاکر کہا۔ "شکریہ ماشیر... تمہارا احسان ہے ہم پر کہ تم نے اہم راز اس بریف کیس میں ڈال کر ہمیں دے دیئے ہیں۔ اب ہم تمہارے احسان کا بدلہ اس طرح اتار سکتے ہیں کہ اسلحہ خانوں اور دیگر جگہوں کو تباہ کر دیں" حبیب نے کہا اور واپس چلنے کا اشارہ کیا۔

ہم واپس چلنے کے لئے قدم بڑھا ہی رہے تھے کہ ماشیر زور سے چلایا۔ اس کا وجود بری طرح لرز رہا تھا۔ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اور پھر وحشت میں ڈوبی ہوئی اس کی آخری چیخ بلند ہوئی....

دوسرے دن کے اخبارات کے پہلے صفحے پر کابل میں ہونے والے ہولناک واقعات کی خبر ہر ایک کے لئے توجہ کا مرکز بنی رہی۔ لیکن مجھے چونکا دینے والی چیز دوسری تھی.... حبیب کی تصویر اخبار میں چھپی ہوئی تھی۔ نیچے جلی حرفوں میں "زندہ یا مردہ دس ہزار روبل انعام" لکھا ہوا تھا۔ "شاید تم نے یہ خبر ابھی تک نہیں پڑھی"۔ میں نے ناشتہ کرتے ہوئے حبیب کی جانب دیکھا۔

"دوست میں اتنا بے خبر نہیں۔ میں یہ خبر پڑھ چکا ہوں۔ لیکن اس سے میرا جوش کم نہیں ہو سکتا۔ اب جبکہ مجھے پتہ ہے میری موت کے دن قریب آگئے تو میں اس طرح کیوں مروں..... میں جہاد میں حصہ لیتے ہوئے شہید کیوں نہ کہلواؤں" میں نے دیکھا حبیب کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ہے۔ "میں تمہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں دوست"۔ میں نے اسے سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔

"اب کیا منصوبہ ہے بھائی"؟ آبلال نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس سلسلے میں کافی سوچا ہے اسلحہ خانہ اور اڈے اڑانا ہمارے لئے اب اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ مسئلہ ہے تو وہ جس کا نام وائزمین ہے... اسے مارنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ اس کے ذہن میں موجود تخریب کاری ہمارے لئے خطرہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس شیطانیت کے پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے..."

میں نے بات مکمل کی اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ "لیکن کس طرح"؟ آرمغان نے وقفے کے بعد سوال کیا۔ "میں نے اس سلسلے میں سوچا ہے...... ماشیر کے مطابق وائزمین جلد جلال آباد آنے والا ہے۔ اس کے قیام کے متعلق بھی ماشیر نے بتایا کہ وہ پہاڑیوں کے اوٹ والی جگہ پر رکے گا۔ یہ جگہ خطرے سے خالی نہیں۔ یہاں ہر قدم پر موت بیٹھی اس کا انتظار کر رہی

شاید کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا..... اسی لمحے میں نے ایک فیصلہ کرلیا اور مجھے اس فیصلے پر عمل کرنے میں ذرا دیر نہ لگی۔ میں نے ڈرائیور کو ایک گھونسہ مارا اس نے کلچ پر سے پاؤں ہٹادیا۔ گاڑی آگے بڑھنے لگی۔

موت قریب..... اور قریب.....آتی جارہی تھی۔

اچانک میں چلّایا "کودو"۔ سب کو جیسے ہوش آگیا ہو۔ دروازے کھلے اور پھر میں نے پیچھے موجود حبیب کو دھکا دیکر باہر کیا اور پھر خود بھی باہر کود پڑا..... آگے والے بھی باہر گر پڑے تھے۔ یہ سب کچھ ایک ہی لمحے میں ہوا تھا۔

اور پھر..... ایک لمحہ بعد..... گاڑی زوردار دھماکے سے پھٹ گئی، اس دھماکے میں ڈرائیور کی دردناک چیخ بھی شامل تھی۔ یکایک مٹی کے نیچے سے بڑا سا دروازہ کھلا اور بہت سے لوگ باہر آگئے میں نے ریوالور پر اپنا ہاتھ مضبوط کرلیا اور برنیف کے کان میں کہا "زندگی..... " "ہاں میں سمجھ گیا" اس نے جلدی سے کہا۔

اتنی دیر میں وہ آدمی قریب آگئے، انہوں نے ہم پر رائفلیں تان لیں۔ برنیف کپڑے جھاڑتا ہوا بولا، "یہ اپنے ہی آدمی ہیں لیکن وہ غدّار تھا جو مرگیا۔ وہ ہم سب کو ماردینا چاہتا تھا...... لیکن اِنہوں نے مجھے بچالیا۔ سب لوگوں نے رائفلیں نیچے کرلیں۔ کچھ دیر بعد ہم اندر موجود تھے..... برنیف ہمیں اپنے کمرے میں لے گیا..... میں نے جائزہ لیا تو تقریبًا سو کے قریب آدمی اندر موجود تھے اور پہرہ دے رہے تھے...... میں ان کو اَبلال کی ایجاد کردہ دوا سے مارنا چاہتا تھا تاکہ اسلحہ خانے پر ہمارا قبضہ ہوجائے۔ ابلال نے کمرہ بند کیا اور پھر اسپرے نکالنے لگا۔

"یہ.... یہ کیا ہورہا ہے؟" برنیف نے کہا۔ میں اس کے قریب پہنچا اور اس کی کنپٹی پر ایک ہاتھ مارکر اسے بے ہوش کردیا۔ پھر ہم نے ماسک پہنے اور اَبلال نے دروازہ کھول کر اسپرے کا بٹن دبادیا..... تیس سیکنڈ بعد ہم نے دروازہ بند کردیا۔ کچھ لمحوں بعد سب کے کھانسنے کی آوازیں آنے لگیں۔

اور پھر خاموشی چھاگئی۔ میں نے باہر جھانکا.... زہریلی دوا اپنا کام دکھا چکی تھی۔ سب لوگ زمین پر مُردہ حالت میں پڑے تھے۔ "ہمیں جلد از جلد واپس پہنچ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کو اطلاع کرنی چاہیئے تاکہ وہ رات ہی میں اس جگہ سے اسلحہ لے جائیں....." ارمغان نے کہا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے"۔ میں نے تائید کی۔ میں نے برنیف کی طرف دیکھا جو اُٹھا پڑا تھا۔ میں نے ریوالور نکالا اور اس کی کنپٹی پر رکھ کر سب کی طرف دیکھنے لگا۔

اچانک وہ ہوش میں آگیا.... اور پھر اپنی کنپٹی پر ریوالور دیکھ کر چلّایا۔

"نہیں... نہیں" میں دھیرے سے مسکرایا اور بولا،

"تم لوگ کبھی اپنے نہیں ہوسکتے"۔ یہ کہہ کر میں ٹرائیگر پر زور دینے لگا۔ (باقی آئندہ)

"مگر... مگر تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" برنیف نے نروٹھا کہا۔ "تمہیں کچھ نہیں کرنا... اس اسلحہ خانے تک ہمیں پہنچانا ہے.... دوسروں کو یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہم تمہارے ہی آدمی ہو اور تمہارے لئے جاسوسی کرتے ہیں اگر تم نے اس وقت کچھ کہا تو یہ گن تم دیکھ رہے ہو گے۔ ہم اسے جیکٹ میں چھپا کر رکھیں گے اور ہماری جیبوں میں ریوالور موجود ہوں گے۔

تم نے جہاں کچھ بولا وہاں تم گئے۔ ہماری فکر نہیں کرنا کہ اس کے بعد کیا ہوگا بس تم اپنی فکر کرو..... موت یا زندگی.... اس کا فیصلہ اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

برنیف سوچنے لگا اور میں باہر دیکھنے لگا۔ جہاں مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا.... میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور پیکٹ برنیف کی طرف بڑھایا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ لی اور سلگا کر سوچنے لگا۔ چند ہی لمحوں بعد اس کے لب کھلے۔

"موت اور زندگی میں.... میں نے زندگی کو فوقیت دی ہے۔ اور اب وہی ہوگا جو تم چاہو گے۔"

میدانی علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ اور ڈرائیور نے ایک خاص لائٹ آن کر لی اور پھر میں نے دیکھا جیسے ہی لائٹ زمین پر پڑی وہاں سے زمین کے اندر کا حصہ صاف نظر آنے لگا۔ جس میں جگہ جگہ ڈائنامیٹ لگے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ گاڑی بچا کر نکل گیا۔ اچانک ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ ہم نے سامنے دیکھا کہ آدھے فرلانگ کے فاصلے پر ایک بڑا بم نصب ہے.... ڈرائیور نے پہلا گیئر بدلا اور کلچ دبا کر اسپیڈ دینے لگا۔ ہم سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ اچانک اس نے ہماری طرف دیکھا اور کہا،۔۔۔

"سنو.... مجھے زندگی نہیں موت پیاری ہے۔ لیکن میری اس موت کے ساتھ تم بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ سامنے جو بم نصب ہے یہ سب سے خطرناک اور آخری بم ہے.... جو ایک لمحے میں ہم سب کی جان لے لے گا.... مجھے کسی کی بھی پرواہ نہیں.... نہ اپنی نہ تمہاری نہ برنیف کی..... میں اپنے ملک کو شکست سے دوچار نہیں دیکھنا چاہتا،۔۔۔"

ہم سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ موت ہمارے بالکل قریب تھی۔ ڈرائیور کسی بھی لمحے کچھ سے پیر ہٹا سکتا ہے۔ اور..... اور پھر.... سب کی خاموشی..... کوئی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ انہیں پتا تھا کہ اگر حرکت کی تو یہ ضرور گاڑی دوڑا دے گا۔

میں پریشان ہو کر سب کی طرف دیکھنے لگا.... سب کے چہرے پھیکے پڑے تھے..... موت کو اتنے قریب سے

مطمئن تھا۔ اس کا چہرہ کیلوں سے بھرا ہوا تھا شاید زندگی میں ہی اسے چھٹکار نصیب ہوئی تھی۔ چہرہ کلین شیو تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی سیدھے ہاتھ پر موڑی اور آگے بڑھا دی۔ کچھ لمحوں بعد ایک زوردار دھچکا لگا اور گاڑی رک گئی۔

"کیا ہوا ہے" اس آدمی نے چونک کر کہا۔ "جی جی برنیف صاحب آگے کوئی آدمی سڑک پر پڑا ہے .... شاید شاید مر گیا ہے"۔ ڈرائیور ہکلایا۔

"چلو دو میرے پاس وقت بہت کم ہے" برنیف نے فوراً کہا۔ ڈرائیور ہچکچایا اور پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور پھر گاڑی سڑک پر پڑے آدمی کے قریب پہنچی برنیف نے فوراً کہا "اسٹاپ" ڈرائیور نے فوراً گاڑی کو بریک لگایا۔ چرچرانے کی آواز کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ ڈرائیور نے فوراً لمبا سانس لیا اور رومال نکال کر پسینہ صاف کرنے لگا۔

"اترو اور دیکھو یہ کون ہے" برنیف نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈرئیوار نے سوئچ آف کیا اور دروازہ کھولا۔ اس کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ کچھ گھبرایا ہوا ہے۔ ڈرائیور قریب پہنچا اور اس کو الٹا کر دیا۔ ڈرائیور کا سانس بے جان جسم کو دیکھ کر مزید الجھ گیا۔ وہ واپس کھڑا ہوا اور گاڑی کے قریب آکر بولا "سر .... یہ مر چکا ہے"۔ "اوہ .... لیکن" برنیف خاموش ہو گیا۔ ڈرائیور نے دیکھا اس کا چہرہ خوف سے پیلا ہو گیا۔ آنکھوں میں حیرت کے کئی طوفان چھپے صاف نظر آرہے تھے۔ ایسا لگتا تھا وہ پتھر کا ہو گیا۔ ڈرائیور کچھ دیر کچھ نہ بول سکا۔ پھر اُس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر بڑی طرح چونکا۔ اپنے لرزتے جسم کو سنبھالتے ہوئے اس نے دیکھا کہ پانچ آدمی جو پینٹ قمیض میں ملبوس تھے ہاتھوں میں اسٹین گنیں لئے کھڑے تھے۔ ڈرائیور کی زبان ساکت ہو گئی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود لب نہ کھول سکا اور برنیف کی طرف دیکھنے لگا جو ابھی تک اسی کیفیت سے دوچار تھا۔

"تم .... تم لوگ کون ہو"؟ آخر برنیف تھرتھراتے ہوئے لفظوں کو یکجا کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری موت جو زندگی بھی بن سکتی ہے" ان میں سے ایک شخص بولا جس کے نقوش روسی تھے۔

"کیسے"؟ برنیف نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"باقی باتیں گاڑی میں بیٹھ کر ہوں گی" یہ کہہ کر حبیب اور ارفع گاڑی میں آگے بیٹھ گئے اور ہم تینوں برنیف کے ساتھ پیچھے بیٹھ گئے۔

"سنو ہم تمہارے دوست بھی بن سکتے ہیں ... لیکن یہ یاد رکھنا ہماری دشمنی بہت خطرناک ہوتی ہے۔ اس کا پہلا ثبوت تم ماشیر کی موت سے لے سکتے ہو"

"کیا .. کیا ... ماشیر کو۔"

"ہاں وہ ہمارے ہی ہاتھوں جہنم رسید ہوا" ارمغان نے برنیف کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ہوگی کہ کب گولی آتے اور اس کا نشانہ بنے۔ جلال آباد کا نواحی علاقہ ختم ہونے کے بعد میلوں پھیلے ہوئے چٹیل میدان کے بعد وہ علاقہ آجاتا ہے جو ہماری تباہی کا ذمہ دار ہے۔ اس علاقے میں خاردار تاریں چالیس فٹ اوپر ہیں۔۔ جن پر چڑھنا ناممکن ہے اس جگہ اونچے ٹیلے پر ایک گول گھومنے والی روشنی ہے جو گول گھومتی رہتی ہے اور اس کی روشنی کو دیکھتے ہوئے مسلح افراد رائفل تانے کھڑے رہتے ہیں۔ اگر کوئی اس روشنی کی زد میں آجائے تو وہ گولیوں سے چھلنی ہونے میں وقت نہیں لیتا۔ ہمیں خطروں سے کھیلتے ہوئے اس مقام تک پہنچنا ہے۔ مگر ابھی وائزمین کو آنے میں دن ہیں۔ جب تک۔۔۔۔۔ میں اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا اور صراحی سے پانی نکال کر پینے لگا۔ میرا گلا سوکھ گیا تھا۔

"آپ آگے کیا کہہ رہے تھے"؟ ارفع بے چین نظر آرہا تھا۔ میں نے سب کی طرف دیکھا اور گلاس رکھتے ہوئے کہا۔" اس عرصے میں ہم قندھار کا اسلحہ خانہ تباہ کردیں گے۔"

"قندھار کے مشرقی سمت وسیع علاقے پر پھیلے ہوئے اسلحہ خانے کا پتا شاید ہی کسی کو ہے۔ دکھائی دینے میں یہ ایک عام سی جگہ ہے لیکن اس کے نیچے جسے تہہ خانہ بھی کہا جا سکتا ہے کافی بڑے رقبے پر اسلحہ خانہ ہے کچھ ہتھیار یہاں بھی تیار ہوتے ہیں جن میں ہینڈ بم، دیسی بندوقیں اور بارودی سامان۔۔۔۔۔ مگر اس جگہ کو خفیہ رکھنے کی اصل وجہ وہ میزائل، راکٹ لانچر اور ٹینک ہیں جو مصیبت کے وقت نہ صرف کام آتے ہیں بلکہ بہت بڑا نقصان بھی کرتے ہیں۔" میں نے تفصیل پڑھ کر سنائی۔

میرے ہاتھ میں وہ نقشہ و کاغذ تھا جو ہم نے ماشیر سے حاصل کئے تھے۔ قندھار کے خفیہ اسلحہ خانے میں بہت کچھ موجود تھا۔۔۔ مگر اس تک پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔ کیونکہ بارودی سرنگیں موجود تھیں اگر کوئی انجان آدمی یہاں پاؤں بھی رکھ دے تو وہ بھی قیمہ بن جاتا۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی حل تھا۔ ایک حل یا ایسی چابی جو اس تالے کو کھول دے اور وہ چابی تھی برنیف۔"

یہ شخص اس اسلحہ خانے کا انچارج تھا۔ اور اس جگہ کا خالق بھی یہ تھا کی تاریکی میں اس جگہ کو بنایا گیا تھا۔ اس حوالے سے برنیف وہ واحد شخص تھا جو ہمیں با آسانی کسی مشکلات کے بغیر وہاں تک پہنچا سکتا تھا۔

اور برنیف تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ اس کی رہائش گاہ شہر کے بیچ میں واقع تھی۔ اس کے مکان کے چاروں طرف سخت پہرہ لگا رہتا تھا۔ اس لئے اس کے مکان تک پہنچ کر ہم خطرہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ اور پھر میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ میں اگلی رات کا انتظار کرنے لگا۔

وسیع مکان سے سفید گاڑی نکلی۔ چوکیدار جو اسلحے سے لیس تھے سلیوٹ مار کر سیدھے کھڑے ہوگئے۔ اندر بیٹھا ہوا آدمی بہت

ماہنامہ
آنکھ مچولی

اچھا پڑھیے

آگے بڑھیے

آپ کی علمی ضرورت بھی ہے اور آپ کے ادبی ذوق کی تسکین بھی
اسے باقاعدگی سے پڑھنے کے لئے اور اس کے حصول کو آسان بنانے کے لئے

ہماری خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہو جایئے

اس میں مالی منفعت بھی ہے اور علمی فائدہ بھی
اسے حاصل کرنے کی ذمہ داری ہم پر ڈال دیجئے

ماہنامہ آنکھ مچولی (خصوصی بچت اسکیم) گرین گائیڈ اکیڈمی ڈی-۱۳ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

خصوصی بچت اسکیم

۱۲ شماروں کی قیمت (مع خصوصی شمارے) رجسٹرڈ ڈاک سے ~~۱۲۰~~ ۹۰ روپے

۲۴ شماروں کی قیمت (مع خصوصی شمارے) رجسٹرڈ ڈاک سے ~~۲۴۰~~ ۱۸۰ روپے

مالی فائدے کے علاوہ زحمت سے نجات رسالے کی بحفاظت ترسیل اور ۲ سال ممبر شپ پر قیمتی کتب بلا معاوضہ

میں ماہنامہ "آنکھ مچولی" کی خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہونا چاہتا / چاہتی ہوں
اس کوپن کے ساتھ ۱۲/۲۴ شماروں کی قیمت مبلغ ..... روپے کا بینک ڈرافٹ / پوسٹل آرڈر
منی آرڈر کی رسید منسلک ہے ـــــ میرے نام حسبِ ذیل پتے پر ماہ ...... سے ماہنامہ
جاری کر دیا جائے۔

نام ـــــــــــــــــــــــــــــ

مکمل پتہ ـــــــــــــــــــــــــــــ

کوئی ضروری ہدایت ـــــــــــــــــــــــــــــ

فون نمبر ـــــــــــــ دستخط ـــــــــــــ

آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کیلئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کے تحائف

راہنما کتابیں

اِن کا مطالعہ —— علم بڑھائے گا
اِن کی موجودگی —— مفید ثابت ہو گی

قرآنی حکایات کا ۱۰۴ صفحات پرمشتمل خوبصورت مجموعہ ۔
اس کے حصول کے لئے ۱۰ روپے کا منی آرڈر بھجوائیں

خاکِ وطن سے سرزمین حرم تک، معلومات بھی راہنمائی بھی
حجاج اور زائرین کے لئے نادر تحفہ ۔ ۲۰۳ صفحات

اسلام کی بنیادی معلومات جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے ۔ مولانا مفتی کفایت اللہ کی تالیف (چار حصے)

تعلیم الاسلام مفت حاصل کرنے کے لئے فی کتاب ۳ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھجوائیں۔ رقم یا کم ڈاک ٹکٹ قابل قبول نہ ہوں گے

کتاب منگوانے کے لئے اِس پتے پر خط لکھیں۔

گرین گائیڈ بک سیریز گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲ ڈی ۔ سائٹ کراچی ۱۶

چاکلیٹ کی کہانی

ش، فاروقی

چھٹّی کا دن تھا اور صبح کا وقت۔ دادا جی باغیچے میں بیٹھے ہوئے دھوپ سینک رہے تھے اور ساتھ ہی اخبار بھی پڑھ رہے تھے۔ تبھی انہیں آٹھ سالہ حارث نظر آیا جو کرکٹ کا بلّا ہاتھ میں اُٹھائے گلی میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے جا رہا تھا۔

دادا نے حارث کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب سے چاکلیٹ نکال کر دی۔ دادا کو یوں تو سبھی بچّوں سے بہت پیار تھا لیکن حارث سے انہیں خاص اُنسیت تھی کیونکہ حارث

دوسرے بچوں سے زیادہ باادب ذہین اور لکھنے پڑھنے میں تیز تھا۔ حارث کی ایک اور خاص بات دادا کو بہت پسند تھی کہ حارث ہمیشہ مختلف چیزوں کے بارے میں سوالات کرتا تھا۔ دادا اُسے کوئی کہانی سناتے تو وہ کہانی کے کرداروں اور ان کے کارناموں کے بارے میں دادا سے ڈھیروں سوالات کرتا۔ یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ اور دادا اکتائے بغیر حارث کے سوالوں کے مناسب جواب دے کر اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے۔

چنانچہ حارث نے حسبِ عادت چاکلیٹ ملتے ہی اس کے بارے میں سوال کر دیا۔

" دادا جی یہ چاکلیٹ کس چیز سے تیار ہوتی ہے"۔؟

دادا نے مسکراتے ہوئے اس انداز سے حارث کو دیکھا گویا انہیں پہلے ہی حارث سے اس سوال کی توقع تھی۔ اور پھر اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے گہرا سانس لیا۔ اور یوں گویا ہوئے۔

" چاکلیٹ کوکو کے پیڑ کے بیجوں سے تیار ہوتی ہے۔ میکسیکو کے عظیم بادشاہ اور فاتحِ اسپین ہیرنڈو کورٹس نے ۱۵۲۸ء میں ایک خفیہ مشروب اسپین بھیجا تھا جو چاکلیٹ کہلاتا تھا۔ یہ مشروب میکسیکو میں آباد ہندوستانی نژاد لوگوں کا من پسند مشروب تھا۔ ہندوستانی نژاد لوگ کوکو کے بیجوں کو پانی میں ڈال کر اُبال لیتے تھے اور پھر اس میں کچھ مسالے ملا کر پیتے تھے۔ چونکہ اس مشروب کا ذائقہ قدرِ تُرش ہوتا تھا اس لئے وہ لوگ اس میں شکر ڈال کر پیا کرتے تھے۔ بس یہیں سے چاکلیٹ کی پیداوار کا آغاز ہوا۔ تاہم اسپین کے لوگوں نے چاکلیٹ بنانے کا طریقہ بہت دنوں تک خفیہ رکھا"۔

" تو دادا جی! چاکلیٹ میکسیکو سے دوسرے ممالک میں کس طرح پہنچی؟" پُرتجسس آنکھوں والے حارث نے ایک اور سوال کیا۔

دادا جی بولے " ۱۹۰۶ء میں کوکو کے بیج اٹلی لائے گئے۔ پھر وہاں سے یہ آسٹریلیا اور فرانس پہنچے۔ البتہ کوکو کے بیجوں سے خشک چاکلیٹ ۱۶۵۷ء میں ایک فرانسیسی نے بنائے تھے۔ اور اُس نے یہ چاکلیٹ لندن لے جا کر بھاری قیمت پر فروخت کئے تھے"۔

" اچھا دادا جی چاکلیٹ بنانے کا پہلا کارخانہ کہاں قائم ہوا؟" حارث نے پوچھا۔ اور یہ پوچھتے ہوئے وہ مزے سے چاکلیٹ چوس رہا تھا۔

" بیٹا ایک فرانسیسی نے ۱۸۱۹ء میں چاکلیٹ بنانے کا پہلا کارخانہ "رزوئی" نام کے شہر میں قائم کیا۔ اس کارخانے میں چاکلیٹیں گولیوں کی صورت میں تیار ہوتی تھیں۔ ابتدا میں چاکلیٹ کا معیار اچھا نہیں تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے معیار میں بہتری پیدا ہوئی۔ دودھ والا چاکلیٹ سب سے پہلے ویٹل پیٹر نام کے ایک شخص نے تیار کیا"۔

دادا جی کی بات ختم ہوئی تو حارث کچھ دیر تک غور و فکر کے انداز میں بیٹھا آنکھوں کو تیزی کے ساتھ جھپکاتا رہا۔
اور پھر کچھ دیر کے بعد اس نے دادا سے کہا،
" دادا جی مگر چاکلیٹ بنتی کس طرح ہے؟"
"کرتے یہ ہیں بیٹا کر سب سے پہلے کوکو کے بیجوں کو بڑے بڑے ڈرموں میں بھونتے ہیں۔ لیکن بھونتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کس درجۂ حرارت تک بیجوں کو بھوننے سے وہ زیادہ مزیدار لگیں گے۔ بہر حال بیجوں کو اس وقت تک بھونا جاتا ہے، جب تک ان کا رنگ بھورا نہیں ہو جاتا۔"
اتنا کہنے کے بعد دادا جی کچھ دیر تک خاموش رہے اور پھر حارث کی طرف دیکھ کر بولے۔ "تم نے خیال کیا کہ ابھی تم نے جو چاکلیٹ کھائی ہے وہ تمہارے منہ میں آسانی کے ساتھ گھل گئی۔"
حارث نے اثبات میں سر ہلایا تو دادا جی نے کہا، "چاکلیٹ میں جلد گھل جانے کی خاصیت پیدا کرنے کے لئے اس کے پاؤڈر کو تقریباً ۲، گھنٹے تک "کونچ" نام کی مشین میں رکھا جاتا ہے۔ بعد میں اس میں دیگر چیزیں ملا کر ٹھنڈا کر کے اسے پیک کر دیتے ہیں۔ بنا دودھ کی چاکلیٹ عام طور پر ایک سال تک خراب نہیں ہوتی۔"
اس کے بعد دادا جی اٹھتے ہوئے بولے" اب تو چاکلیٹیں بے شمار صورتوں، ذائقوں اور رنگوں میں بننے لگی ہیں اور اب تو چاکلیٹ کے کالر بھی بننے لگے ہیں۔ ان کالروں کو تم جب چاہو اپنی قمیض سے نکال کر کھا سکتے ہو۔"
حارث نے حیرت سے دادا کی طرف دیکھا۔ اور اس کے بعد پاس ہی زمین پر پڑا کرکٹ کا بلا اٹھایا اور باہر کھیلنے کے لئے چلا گیا۔

آنکھ مچولی کے پرانے شمارے کیسے منگائیں ؟

ہمیں بے شمار بچوں کے ایسے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن میں انہوں نے "آنکھ مچولی" کے پرانے شمارے بھیجنے کی فرمائش کی ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی "آنکھ مچولی" کی البم مکمل کر سکیں۔
جو ساتھی پرانے شمارے منگانا چاہتے ہیں وہ فی شمارہ ۵، روپے اور سالنامہ و خاص نمبر ۱۰ روپے کی شرح سے ماہنامہ آنکھ مچولی کے پتہ پر منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر روانہ کردیں۔ انہیں مطلوبہ شمارے فوراً روانہ کر دیئے جائیں گے۔

نویں وکٹ کا عالمی ریکارڈ

محمد وسیم مُغل

کرکٹ آج کا مقبول ترین کھیل ہے۔ کرکٹ کو "ریکارڈز" کا کھیل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کھیل میں ریکارڈ بنتے بھی ہیں اور ٹوٹ بھی جاتے ہیں، لیکن چند ریکارڈ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے "کرکٹ ریکارڈز بک" میں درج ہو جاتے ہیں۔ اس وقت پاکستان بھی کرکٹ کی ایک مضبوط ٹیم ہے۔ پاکستانی کھلاڑیوں نے بھی ایسے ریکارڈ قائم کیے ہیں جو ابھی تک نہیں ٹوٹے۔ انھی میں سے ایک ۶۸-۶۷ کی سیریز میں بنا۔ جب پاکستان انگلینڈ سے اوول کے تاریخی گراؤنڈ پر ٹیسٹ آزما تھا۔ وہ ۲۸ اگست کا دن تھا۔ جب آصف اقبال اور انتخاب عالم مردِ بحران بن کر میدان میں اُترے۔ اُن دونوں کھلاڑیوں نے نویں وکٹ کی شراکت میں عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ اُس دن پاکستان کے ۸ کھلاڑی صرف ۶۵ رنز پر آؤٹ ہو چکے تھے۔ ان آٹھ کھلاڑیوں میں حنیف محمد، سعید، مشتاق محمد، ماجد خان اور جاوید برکی جیسے بہترین کھلاڑی بھی شامل تھے۔ پاکستان کو اننگز کی شکست سے بچنے کے لیے ۲۲۵ رنز درکار تھے۔ اس مرحلے پر آصف اور انتخاب نے انگلینڈ کو شاندار فتح سے جو اب محض تھوڑی دور ہی رہ گئی تھی، دُور کر دیا۔

ان دونوں پاکستانیوں نے انگلینڈ کے بولرز ہگنز، آرمز، ٹمس اور انڈروڈ کی وہ پٹائی کی، جسے وہ کبھی بھلا نہ سکیں گے۔ آصف اقبال اور انتخاب عالم کے بلّوں سے رنز کا سیلاب رواں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگلینڈ کے کھلاڑی بولنگ کرانا ہی بھول گئے ہوں۔ آصف نے اپنی سینچری ۱۳۹ منٹ میں مکمل کر لی۔ انگلینڈ کے کھلاڑیوں پر شدید مایوسی کا غلبہ تھا۔ آخر چائے کے وقفے سے کچھ دیر قبل انگلینڈ کے مایوس کپتان نے خود گیند لی۔ اس وقت پاکستان کا مجموعی اسکور ۲۵۱ رنز تھا۔ انگلش کپتان نے پہلی گیند فُل ٹاس پھینکی اور گیند آصف اقبال کے بلّے سے ٹکراتے ہی باؤنڈری کے باہر پہنچ گئی مگر پھر دوسری گیند پر آصف اقبال کریز سے باہر نکل آئے اور گیند یکدم ٹرن ہو کر وکٹ کیپر کے محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی اور اُس نے آصف کو اسٹمپ آؤٹ کر دیا۔ آصف نے ۲ چھکّوں اور ۲۱ چوکوں کی مدد سے ۱۴۶ رنز بنائے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ اُسی اسکور یعنی ۲۵۵ رنز پر انتخاب عالم بھی پویلین سدھار گئے۔ اس طرح پاکستان کی پوری ٹیم آؤٹ ہو گئی۔ اب انگلینڈ کو میچ جیتنے کے لیے ۳۱ رنز کی ضرورت تھی مگر ان ۳۱ رنز کے حصول کے لیے انھیں اپنی دو وکٹیں گنوانی پڑیں اور یوں یہ میچ جو انھیں ایک اننگز سے جیتنا چاہیئے تھا، آٹھ وکٹوں سے جیت سکے۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ وہ دو کھلاڑی آصف اقبال کی گیندوں پر آؤٹ ہوئے تھے۔

یہ میچ تو انگلینڈ جیت گیا مگر آصف اقبال اور انتخاب عالم نے اپنا نام تاریخ کے صفحات میں درج کروالیا۔ ان دونوں پاکستانی کھلاڑیوں نے ۱۷۰ منٹ میں ۱۹۰ رنز بنائے جو نویں وکٹ کا عالمی ریکارڈ تھا، ہے اور شاید کرکٹ ریکارڈز بک میں ہمیشہ سنہری حروف سے جگمگاتا رہے گا۔

انکل آئی کیو روبوٹ

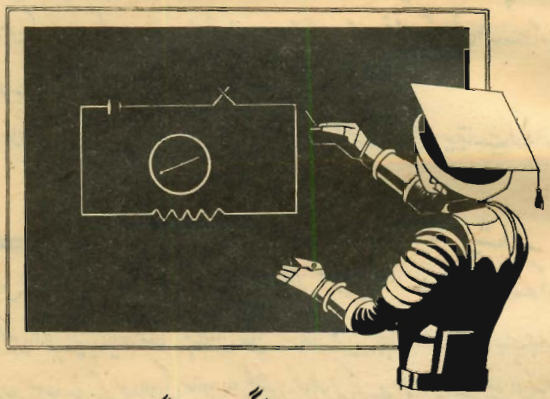

سوالاً جواباً

انکل کہا جاتا ہے ہم کو چاند کا صرف ایک طرف کا حصّہ نظر آتا ہے؟ کیا یہ درست ہے اگر درست ہے تو ایسا کیوں ہے؟

سیما صدّیقی ——— فیڈرل بی کیپٹل ایریا۔ کراچی

جب انسان نے چاند کو پہلی مرتبہ دیکھا تو اُس نے اس کی چمک دمک دیکھ کر اسے اپنا دیوتا بنالیا اس کا اپنا خیال تھا کہ یہ رات کا دیوتا ہے لیکن اب ہم جانتے ہیں کہ چاند کی یہ روشنی یہ آب و تاب مانگے کی ہے۔ یہ سورج کی روشنی کا انعکاس ہے آج ہمیں پہلے کے مقابلے میں چاند کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ چاند کے دوسرے رُخ کی تصاویر امریکی اور روسی سائنسدان لے چکے ہیں۔ یہ بات کہ ہم کو چاند کا صرف ایک رُخ نظر آتا ہے

سادہ سی بات ہے۔ چاند زمین کا ذیلی سیّارچہ ہے جو زمین کے گرد مدار میں گھومتا ہے اور زمین سورج کے گرد چکّر لگاتی ہے۔ زمین کے گرد چاند کا یہ سفر ۲۹½ دنوں میں مکمّل ہوتا ہے۔

چاند اپنے مدار میں گردش میں ہوتا ہے لیکن زمین کے گرد گردش کا وقت یکساں ہوتا ہے اس وجہ سے ہمیں چاند کا صرف ایک ہی رُخ نظر آتا ہے۔ سائنسدانوں نے بتایا ہے کہ زمین سے چاند کا صرف ۵۹ فیصد

حصہ دیکھا جاسکتا ہے۔

آپ اس بات کا تجربہ بھی کرکے دیکھ سکتے ہیں۔ آپ اپنے بائیں ہاتھ کا گھونسہ بنائیں اور یہ تصور کریں کہ یہ زمین ہے۔ پھر کوئی پھل سیب یا نارنگی لیں اس کے آدھے حصے کو نشان زد کریں اور اسے چاند تصور کریں۔ اور چاند کا ایک رُخ زمین کی طرف رکھیں۔ اور دونوں کو ایک ساتھ ایک ہی رخ میں گھمائیں اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ گردش میں رہتے ہوئے کس طرح چاند کا ایک ہی رُخ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔

ابھی ابھی ایک دو سال پہلے میکسیکو میں بہت ہولناک قسم کا زلزلہ آیا تھا۔ ہمیں یہ بتایئے کہ زلزلہ کیسے آتا ہے؟

ماریہ اقبال ——— پشاور

پہلے یہ ممکن نہیں تھا کہ کسی زلزلے کی پیش گوئی کی جاسکے۔ ممکن تو اب بھی نہیں ہے کہ زلزلے کی بالکل صحیح پیش گوئی ہو سکے لیکن اب یہ بتایا جاسکتا ہے کہ کون کون سے علاقے ہیں جہاں زلزلہ آسکتا ہے ہمارے آلات اور احساسات زلزلوں کے پیدا ہوجانے کے بعد ان کی موجوں اور جھٹکوں کو محسوس کرتے ہیں اس سے پہلے ان کو محسوس نہیں ہوتا یہ ضرور ہے کہ زلزلوں کی ابتدائی ہلکی موجیں جو کبھی بڑی موجوں کی پیش رو ہوتی ہیں انسانوں سے پہلے جانوروں کو محسوس ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ اُن کی نہایت دھیمی آواز جو انسانی کانوں سے نہیں سُنی جاسکتی۔ جانور سُن لیتے ہیں۔ کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ گائے بیل پریشانی میں ادھر اُدھر بدکنے لگتے ہیں۔ اور اس کے فوراً بعد ہی زلزلہ آتا ہے۔ زلزلے کے جھٹکے موجوں کی شکل میں ہم تک پہنچتے ہیں۔ موجیں صرف پانی یا بہنے والی چیزوں میں نہیں پیدا ہوتیں۔ ٹھوس چیزوں میں بھی موجیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اپنی خاص رفتار رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ریل گاڑی جب مکان کے قریب سے گزرتی ہے تو مکان میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ مکان لرزنے لگتا ہے۔ کھڑکیاں ہلنے لگتی ہیں۔ بالکل یہی کیفیت زلزلوں کی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں ارتعاش پیدا کرنے والی چیز ریلوں اور بھاری گاڑیوں سے اربوں کھربوں گنا زیادہ طاقت ور ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں جوہری بم اور ہائیڈروجن بم معمولی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

اس میں شک نہیں کہ آتش فشاں پہاڑ بھی ایک حد تک زلزلے پیدا کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ زلزلے معمولی ہوتے ہیں اور ان کا اثر مقامی ہوتا ہے۔ لیکن جن زلزلوں کا ہم ذکر کر رہے ہیں ان کا آتش فشانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ زمین کی بالائی پرت کے ٹوٹنے اور اُس میں رگڑ کھانے سے وجود میں آتے ہیں۔ اگر آپ زمین کی بناوٹ کو سامنے رکھیں تو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوگی۔ زمین کا اوپری حصہ ٹھنڈا ہے اور سخت ہے لیکن ایک زمانے میں یہ گرم اور نرم تھا جب زمین رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہونے لگی تو اوپر کا حصہ پہلے ٹھنڈا ہوا پھر جب نیچے کا حصہ کچھ سرد ہوا تو ظاہر ہے کہ سرد ہوکر اس کا حجم کم ہوگیا

جب نیچے کا حصہ حجم میں کم ہو جائے تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ یا تو اوپر کا حصہ سکڑ جائے یا تڑخ جائے ۔ یا اپنی جگہ پر قائم رہے لیکن اس کے اور نیچے کے حصے کے درمیان زبردست خلا پیدا ہو جائے ۔ ہماری زمین میں یہ تینوں کیفیتیں موجود ہیں۔ اوپر کی پرت کہیں پر پھٹ گئی ہے اور ہزاروں میل زمین میں لمبا شگاف پڑ گیا ہے۔ کہیں پر یہ سکڑ گئی ہے جس سے پہاڑ وجود میں آتے ہیں ۔ زمین بالکل اُسی طرح تہہ بہ تہہ ہو جاتی ہے جس طرح کپڑا یا کیمل ہوتا ہے ۔ ہمالیہ کا سلسلہ اس کی مثال ہے پہلے اس برّ عظیم پاک و ہند کا سارا شمالی حصہ سارے کا سارا بہت بڑا سمندر تھا۔ صرف زمین کا وہ حصہ جسے ہندوستان میں دکن کا علاقہ کہتے ہیں خشک تھا ۔ زمانے کے ساتھ ساتھ جنوبی حصے نے شمال کی طرف حرکت کرنا شروع کیا اس طرح دکن اور تبت کے بیچ میں جو سمندر تھا اُس کی تہہ بلند ہونے لگی ۔ اس میں سلوٹیں پڑنے لگیں۔ اور آخر کار یہی سلوٹ دار حصہ ہمالیہ کہلایا۔ اور کتنی عجیب بات ہے کہ عظیم الشان سلسلہ ہمالیہ دراصل سمندر کی تہہ ہے جو جنوبی دباؤ سے بلند ہو گئی ہے صرف یہی نہیں بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دباؤ صرف برّ اعظم کے شمالی حصہ تک محدود رہا یعنی پنجاب بھارت کے صوبے اُتر پردیش اور بنگلہ دیش کے علاقے تک ، لیکن اس برّ اعظم کے مشرق اور مغرب میں یعنی آسام میں اور ہمارے شمال مغربی اور سرحدی علاقہ میں وہ دباؤ نہیں پہنچا ۔ چنانچہ یہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہے اور شکل یہ بنی کہ ہمالیہ مشرق اور مغرب میں جنوب کی طرف مڑ گیا ۔ یہی دونوں وہ علاقے ہیں جہاں زبردست زلزلے آتے ہیں ان دونوں علاقوں میں زمین کی پرتیں کمزور پڑ گئی ہیں۔ اور یہ ٹوٹنے لگتی ہیں ۔ یہاں پر اندر ہی اندر زمین کی پرت رگڑ کھاتی ہے اور اس رگڑ کی وجہ سے ایسا زبردست ارتعاش پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اطراف کا تمام علاقہ لرز کر اور ہل کر برباد ہو جاتا ہے اس لیے ہم زلزلوں کی پیش گوئی نہیں کر سکتے ۔ اس کی مثال ایک عمارت کی کمزور چھت کی سی ہے جس کی کڑیاں ٹوٹ چکی ہیں اور وہ گرا ہی چاہتی ہے، لیکن کب گرے گی یہ کوئی نہیں بتا سکتا ۔ اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ کن کن علاقوں میں زلزلوں کا امکان ہے لیکن یہ نہیں بتا سکتے یہ کب واقع ہوں گے ۔ دنیا کے جن علاقوں میں زلزلوں کا امکان ہے ان میں بنگلہ دیش کے شمالی علاقے پاکستان کے شمال مغربی علاقے ایران، ترکی، یونان، البانیہ اور ان کے مزید شمال مغرب میں آئس لینڈ کے علاقے شامل ہیں بحرالکاہل کا پورا کنارہ چاروں طرف یعنی مشرق، شمال اور جنوبی امریکہ کے مغربی حصّے اور مغرب میں جاپان، چین اور جنوب مشرقی ایشیا کے سارے جزیرے زلزلوں کے علاقے ہیں۔ یہاں زلزلے آتے رہیں گے آتش فشاں پہاڑ پھوٹتے رہیں گے ۔

انکل نیل آرمسٹرانگ جب چاند پر گیا تو کون سا دن تھا ۔

(اسحاق پرویز، شیر شاہ کالونی کراچی)

نیل آرمسٹرانگ نے بدھ ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ء کو گرینچ مین ٹائم کے مطابق دوپہر ۲ بجکر ۵۶ منٹ پر چاند پر پہلا قدم رکھا۔ ان کے ساتھ ایڈون آلڈرن بھی تھے ۔

نئی تحریریں

فرشتہ اور شیطان

مرسلہ ماریہ حفیظ۔ کراچی

بہت پرانے زمانے کی بات ہے مُلک شام میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا جس کا نام احمر تھا اُس کا ایک دانشمند وزیر بھی تھا جس کا نام خرّم تھا۔ ایک دن بادشاہ کا دِل چاہا کہ کسی فرشتے سے ملاقات کرے۔ اُس نے اپنے وزیر کو بلایا اور کہا" وزیر باتدبیر ہمارا دِل کسی فرشتے سے ملاقات کے لیے بے چین ہو رہا ہے۔ تم دو دِن کے اندر اندر کسی فرشتے سے ہماری ملاقات کرادو" یہ عجیب وغریب حکم سُن کر وزیر بالکل نہیں گھبرایا۔ اُس نے فوراً ایک ترکیب سوچ لی وہ باغ میں گیا اور ایک معصوم بچے کو گود میں اُٹھا لایا۔ وہ بچہ کسی کے ساتھ کھیل رہا تھا، نہ لڑ جھگڑ رہا تھا بلکہ ایک کونے میں خاموش کھڑا تھا۔

وزیر اُس بچے کو اُٹھا کر بادشاہ کے پاس لے گیا اور بولا حضور کی خدمت میں فرشتہ حاضر ہے" بادشاہ بہت خوش ہوا اور وزیر کو ڈھیروں انعام واکرام دیا۔ وزیر نے بادشاہ کو بتایا" یہ میرا ہی بیٹا ہے" بادشاہ اس بات پر اور بھی خوش ہوا۔

اس بات کو کئی سال بیت گئے۔ اب وزیر کا بیٹا جوان ہو چکا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے وزیر سے کہا" ہمارا دل چاہ رہا ہے کہ ہم شیطان کے ساتھ ملاقات کریں" وزیر اب بھی نہ گھبرایا۔ وہ قید خانے گیا اور پھانسی کا حکم پانے والے ایک مُجرم کو لیے ہوئے بادشاہ کے پاس پہنچا اور بولا" بادشاہ سلامت! شیطان حاضر ہے" بادشاہ بہت خوش ہوا اور وزیر کو پہلے سے بھی زیادہ انعام دیا۔ تب وزیر بولا" بادشاہ سلامت! یہ میرا وہی بیٹا ہے، جس کو میں پہلے فرشتے کے طور پر لایا تھا" اس بات سے بادشاہ کو بہت رنج ہوا اور وہ افسوس بھرے انداز میں بولا" آہ پہلے یہ فرشتہ تھا اور اب شیطان!"

سچ ہے کہ بُرے کام کرنے سے، انسان، شیطان بن جاتا ہے۔

مستقبل کا حال

مرسلہ: ستارہ رشید شیخ کراچی

مستقبل کا حال بتانے والوں کو نجومی کہا جاتا ہے نجومیوں کا کہنا ہے کہ وہ ستاروں کی گردش سے مستقبل کا حال بتا سکتے ہیں بہت سے لوگ ان کی باتوں پر یقین بھی کر لیتے ہیں اور اگر کہیں سے اتفاق سے کوئی بات پوری ہو جائے تو ان کا اعتقاد پکا ہو جاتا ہے دراصل یہ ساری باتیں کمزور اعتقاد کی وجہ سے ہوتی ہیں کیونکہ مستقبل کا حال سوائے خدا کے کوئی اور نہیں جانتا۔

برسوں پہلے لوگ گرہن سے بہت خوف زدہ

ہوا کرتے تھے کیونکہ وہ لوگ چاند اور سورج کو اپنا خدا سمجھتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے

اس لئے جب کبھی سورج گرہن ہوتا تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا سورج سے باہر نکل گیا ہے اسی طرح کا ایک واقعہ ہے ایک مشہور مسلمان سیاح افریقہ کے کسی گاؤں میں گیا تو وہاں کے لوگوں کو دھمکی دی کہ انہوں نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا ہے اب وہ سورج کو چھپا دے گا سیاح نے ان لوگوں کو دن بھی بتایا سیاح دراصل ماہر فلکیات بھی تھا. اسے معلوم تھا کہ چند دِن بعد سورج گرہن ہونے والا ہے اور جس دِن سورج گرہن ہوا اُس دِن سارے گاؤں والے اس کے پیروں پر پڑ گئے اور درخواست کرنے لگے کہ وہ سورج کو باہر نکال دے سیاح نے نہ صرف اُن کی بات مان لی بلکہ کچھ دیر بعد سورج بھی باہر نکل آیا دراصل یہ سب کچھ ستاروں کی گردش کے حساب کتاب سے معلوم کیا جاسکتا ہے جو لوگ اس علم کو جانتے ہیں ان کو ماہر فلکیات کہا جاتا ہے یہ لوگ ستاروں اور سیاروں کی گردش کے بارے میں پڑھتے لکھتے رہتے ہیں خلا میں ستاروں کی گردش معلوم کرنے کے لئے علم ریاضی کے کچھ قانون ہیں جن کی مدد سے ستاروں کی حرکات کے بارے میں بالکل صحیح پیشن گوئی کی جاسکتی ہے. ستاروں کی گردش معلوم کرنے میں دوسرے علم بھی کام آتے ہیں جن میں علم طبیعات یا فزکس بھی ہے فزکس کے ماہر بھی ماہر فلکیات کی طرح ستاروں کے مستقبل کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں وہ بتا سکتے ہیں کہ سورج کتنے دِنوں تک کہاں کہاں چمکتا رہے گا کون سا ستارہ ہم کو کس وقت نظر آئے گا دم دار ستارہ کی آمد کی پیشن گوئی بھی اس طرح کی جاتی ہے ہیلے کا مشہور دم دار ستارہ ہر ۷۶ سال بعد اپریل کے مہینے میں زمین کے قریب نظر آتا ہے اس لئے اب یہ پیشن گوئی نہایت آسانی سے کی جاسکتی ہے کہ اب وہ ۲۰۶۲ء کے اپریل میں دوبارہ نظر آئے گا. اب تو انسان نے مصنوعی سیارے کی مدد سے موسم کی پیشن گوئی کو اور بھی یقینی بنا دیا ہے مصنوعی سیارے کے ذریعہ زمین کی تصویر کھینچ لی جاتی ہے اور اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ آئندہ دِن موسم کی کیا صورت حال ہو گی. لیکن سچ بات تو یہ ہے آئندہ کیا ہو گا یہ تو صرف اللہ کو معلوم ہے انسان تو صرف کوشش ہی کر سکتا ہے.

گِردش میں چُوہا

مُرسلہ، طارق احسان، لیاقت آباد کراچی

کسی شہر میں حامد نام کا ایک آدمی رہتا تھا۔ بہت اچھا اور نیک انسان تھا صبح سے لے کر شام تک نوکری کی تلاش میں رہتا۔ مگر اسے کہیں بھی نوکری نہیں ملتی تھی۔ رات کو جب تھک ہار کر سوتا تو اُسے چُوہے بہت پریشان کرتے تھے کیوں کہ اس کے گھر میں بہت چُوہے تھے۔ ساری رات اِدھر سے اُدھر بھاگتے

رہتے اور اُچھل کُود مچاتے جس کی وجہ سے حامد سو بھی نہیں سکتا تھا اگلی صبح جب وہ سو کر اٹھا تو اسے ایک ترکیب سُوجھی اس نے رات کو چوہے دان لگا دیا۔ جس میں اب ایک چوہا پھنسا ہوا تھا اس نے چوہے کو مارا اور تھیلی میں بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور کسی اچھے سے ہوٹل کو تلاش کرنے لگا اسے ایک ہوٹل نظر آگیا حامد ہوٹل میں گیا خوب اچھا سا کھانا منگوایا اور ڈٹ کر کھایا جب پیٹ بھر گیا تو اس نے آخر میں ایک سوپ کا ایک کپ منگوایا جب سوپ آگیا تو اس نے لوگوں سے نظریں بچاتے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چوہا نکال کر سوپ میں ڈال دیا اور شور مچانے لگا کہ سوپ میں مرا ہوا چوہا ہے میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں ہوٹل کے مالک اور بیروں نے اسے سمجھایا کہ وہ شور نہ کرے حامد نے کہا اچھا ٹھیک ہے لاؤ مجھے پیسے دے دو بیروں نے پچاس روپے دے دیئے۔

حامد پچاس روپے لے کر خوشی خوشی اپنے گھر چلا گیا اب حامد کا یہ روز کا معمول بن گیا تھا کہ وہ رات کو چوہا مارتا اور صبح اسے تھیلی میں بند کر کے کسی اچھے سے ہوٹل میں چلا جاتا اور خوب کھانا کھانے کے بعد وہی طریقہ اختیار کرتا اور پیسے لے کر ان میں سے تھوڑے خرچ کرتا اور باقی پیسے جمع کر لیتا۔

اب حامد کھا کھا کر اتنا موٹا ہو گیا تھا کہ اس سے چلا تک نہیں جاتا تھا اس لیے اب وہ قریب کے ہوٹل میں کھانا کھانے جانے لگا تیسری دفعہ حامد جب کھانا کھانے اسی ہوٹل گیا تو ہوٹل والے کو حامد پر شک ہو گیا کیوں کہ اس نے حامد کو سوپ میں چوہا ڈالتے ہوئے دیکھ لیا دو بار حامد بچ چکا تھا لیکن اب پکڑا گیا اور ہوٹل والے سے معافی مانگنے لگا لیکن ہوٹل والے نے اسے معاف نہیں کیا اور خوب مارا کہ حامد بیہوش ہونے کے قریب تھا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اپنے گھر پہنچ گیا اور آئندہ مفت کا کھانا کھانے سے توبہ کر لی حامد سمجھدار تھا اس لیے اس نے جو پیسے جمع کیے تھے ان پیسوں سے اس نے چھوٹا موٹا کام شروع کیا۔

ترقی کرتے کرتے اس کا کاروبار پورے ملک میں پھیل گیا اس کاروبار کی وجہ سے حامد "سیٹھ حامد" کے نام سے پہچانا جانے لگا اور ملک کی مشہور شخصیتوں میں شمار ہونے لگا۔

دیکھا بچو! حامد اپنی ذرا سی غلطی کی وجہ سے کیا سے کیا بن گیا۔

چُپ کا روزہ

تجمل الیاس ——— سمن آباد، لاہور

فہمینہ ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی ذات میں کئی خوبیاں تھیں۔ وہ ساتویں جماعت کی طالبہ تھی اور ہر امتحان میں اوّل آتی لیکن اُس میں ایک خامی یہ تھی کہ وہ بہت زیادہ بولتی تھی، موقع ہو یا نہ ہو، اُس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ جب وہ بولتی تو رُکنے کا نام نہ لیتی۔ والدین اُسے سمجھاتے "بیٹی تم کتنی اچھی ہو تمھارے

استاد تمھیں کتنا پسند کرتے ہیں لیکن تم بولتی بہت زیادہ ہو۔" وہ خود بھی بہت کوشش کرتی تھی لیکن بولتے وقت اپنے اختیار میں نہیں رہتی تھی۔ آخر اُس کے والدین نے ایک ترکیب سوچی اور گھر میں اعلان کر دیا کہ جو بھی چُپ کا روزہ رکھے گا اُسے ایک بہت خوبصورت تحفہ بطورِ انعام دیا جائے گا۔ اُس کے بھائیوں نے تو انکار کر دیا لیکن اُس نے کہا کہ وہ روزہ رکھے گی۔

چنانچہ جمعہ کے دن اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور چُپ کا روزہ رکھا۔ صبح اٹھنے کے بعد وہ امّی سے کچھ کہنے لگی تو امّی نے کہا کہ تمھارا تو روزہ ہے۔ اُسے یاد آ گیا اور وہ خاموش ہو گئی، لیکن ناشتے کے وقت کھٹ بولی کہ میں تو انڈا کھاؤں گی پھر روزے کا خیال آتے ہی وہ خاموش ہو گئی۔ دوپہر کے قریب وہ بے چین سی ہو گئی اور امّی سے کہنے لگی "امّی میں سہیلی کے گھر کھیل آؤں" تو امّی نے یاد دلایا کہ بیٹی تمھارا تو روزہ ہے۔ وہ بہت شرمندہ ہوئی اور اُس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے لیکن کب تک؟ خود سے بہت بولی اور بعد میں اپنے آپ کو کوسنے لگی۔

وہ کھلونے سے کھیل رہی تھی کہ بھائیوں نے کہا "تمھارا تو روزہ ہے" وہ جھنجھلا گئی۔ کیا مصیبت ہے کہ سارا وقت چُپ رہو، لیکن پھر انعام کا خیال آتے ہی چُپ ہو گئی۔ آخر عصر کی نماز سے پہلے امّی کے پاس آئی اور موٹے موٹے آنسو بہاتے ہوئے کہنے لگی "مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں کتنا فالتو بولتی ہوں۔ آئندہ میں ضرورت سے زیادہ بالکل نہیں بولوں گی"

امّی اُسے پیار سے سمجھانے لگیں "ہمارے پیارے نبیؐ بھی بلا ضرورت کبھی نہیں بولتے تھے اور اگر بولتے تو اتنی آہستگی سے کہ الفاظ گننا چاہو تو گن لو۔" اسی لیے پیارے بچو! آپ بھی کم گوئی سیکھیں اور بلا ضرورت نہ بولیں۔

یہ ستارے

مرسلہ: ھمایوں مجاھد تارڑ۔ کھیوڑہ

عجب ہے یہ قدرت کا بھی انتظام
چمکنا ہے بن تیل کے ان کا کام
جو دیکھیں تو لگتے ھیں یہ جاندار
مگر درحقیقت ھیں بے جان مدام
کبھی منحرف ان سے ہوتے نہیں
جو بخشے ھیں اللہ نے ان کو کام
چلتے یہ رہتے ہیں باہم سدا اس طرح
کہ گویا اُخوّت کے ھیں یہ غلام
اُصول ان کے پختہ ہیں کچھ اس طرح
کہ ہرگز بدلتے نہیں ہیں مقام
یہی گر اُصول ہوتے انسان کے
تو تارڑ نہ ہوتا کوئی بے مقام

اکبر نے انگریزی سیکھی

مُرسلہ: جہانگیر احمد مُون،
جاتلاں آزاد کشمیر

کہتے ہیں کسی گاؤں میں اکبر نامی زمیندار رہتا تھا۔ اسے انگریزی سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن اس نے اپنے گاؤں کے اُستاد سے کہا کہ تم مجھے انگریزی سکھا دو میں تمہیں اس کی تنخواہ دوں گا۔ استاد نے اسے ایک لفظ YES یس سکھا دیا۔ اس کے بعد کسان انگلینڈ چلا گیا۔ اور ایک پاکستانی کے ہاں نوکری کر لی۔ ایک دن اکبر کسان شہر کی سیر کی غرض سے شہر گیا۔ جب وہ حلوائی کی دوکان پر پہنچا تو حلوائی نے پوچھا۔ کیا تم برفی کھاؤ گے۔ اکبر کسان نے کہا YES یس۔ اس پر حلوائی نے اسے برفی دی۔ اُسکے بعد وہ پھل فروش کی دوکان پر گیا۔ اس نے پوچھا۔ کیا تم آڑو کھاؤ گے۔ اکبر کسان نے کہا YES یس۔ پھل فروش نے اسے آڑو دیئے۔ اس کے بعد اکبر کسان آگے بڑھا۔ آگے ایک پہلوان تھا۔ پہلوان نے پوچھا۔ کیا تم مجھ سے لڑو گے۔ اکبر کسان نے کہا YES یس۔ پہلوان نے یہ سنتے ہی اس کی پٹائی کر دی۔ شام کو اکبر کسان گھر پہنچا تو مالک نے لنگڑاہٹ کا سبب پوچھا تو اس نے صبح والا واقعہ سنایا۔ تو اس کے مالک نے کہا اب تم یس کے بجائے NO نو کہنا۔ ایک ہفتہ کے بعد جب وہ بازار گیا تو اس سے حلوائی نے پوچھا کیا تم برفی کھاؤ گے۔ تو اکبر نے کہا NO نو اس کے بعد وہ پھل فروش کی دوکان پر گیا۔ پھل فروش نے اکبر سے پوچھا کیا تم آڑو کھاؤ گے تو اکبر نے کہا NO نو۔ آگے پہلوان سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا اس روز والی مار کا کچھ اثر ہوا۔ اکبر نے کہا NO نو۔ پہلوان نے ایک بار پھر اس کی پٹائی کی اکبر بیچارہ مارا مارا گھر پہنچا اور سارا واقعہ سنایا۔ اس کے بعد مالک نے کہا اب آئندہ تم VERY GOOD کہنا دوسرے روز پھر اکبر شہر گیا۔ جب حلوائی نے اس سے پوچھا کہ کیا تم برفی کھاؤ گے تو اکبر نے کہا VERY GOOD تو حلوائی نے اُسے برفی دی۔ اس کے بعد وہ پھل فروش کی دوکان پر گیا۔ پھل فروش نے اکبر سے پوچھا۔ کیا تم آڑو کھاؤ گے تو اکبر نے کہا VERY GOOD تو پھل فروش نے اسے آڑو دیئے۔ اس کے بعد اکبر جب آگے بڑھا تو۔ آگے پہلوان رو رہا تھا۔ اکبر نے پہلوان سے رونے کی وجہ دریافت کی تو پہلوان نے کہا میری ماں فوت ہو گئی ہے۔ اکبر نے کہا۔ VERY GOOD اکبر کے یہ کہنے کی دیر تھی۔ پہلوان اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے بعد جو اکبر کا حال ہوا وہ آپ سمجھ چکے ہیں۔ کیونکہ آپ بہت سمجھ دار ہیں۔

جب تک آپ نلکے پر مُنہ ہٹا لیتے ہیں تو پانی کو دباؤ نلکے کے راستے باہر نکال دیتا ہے اور یہ پانی فوارے کی مانند باہر نکلنے لگتا ہے۔

آؤ ملائیں ہاتھ

اعلان

"آؤ ملائیں ہاتھ" کے کالم میں اپنا تعارف بھیجنے والے ساتھی عام طور پر لکھتے ہیں کہ وہ بڑے ہو کر ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ، کرکٹر، ونگ کمانڈر یا کچھ اور بننا چاہتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ اگر وہ کسی خاص پیشے کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو کیوں؟ ظاہر ہے کسی خاص پیشے کو پسند کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی۔ تعارف بھیجنے والے ساتھیوں سے گزارش ہے کہ وہ آئندہ اپنے مستقبل کے ارادے کے ساتھ ساتھ اس کا سبب بھی بیان کریں۔ جس ساتھی کا جواب سب سے اچھا ہو گا اُسے آنکھ مچولی کا نیا شمارہ بطورِ انعام ارسال کیا جائے گا۔

(ادارہ)

سید نجم الحسن، پندرہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، ہاکی کھیلنا
بڑے ہو کر پائیلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگریزی
مکان نمبر ۱۲۴ بلاک بی، لطیف آباد، ——— حیدرآباد

سید انتظار مہدی، پندرہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، قلمی دوستی
بڑے ہو کر انسپکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگلش
نزد پرانی بنوں چنگی تحصیل و ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان

محمد عارف، تیرہ سال
جماعت ششم، مشغلہ، کتابیں پڑھنا
بڑے ہو کر انجینئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس
مکان نمبر ۱۱ گلی نمبر ۵ دہلی کالونی نمبر ۲، ——— کراچی نمبر ۶

غلام احمد، تیرہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، سکے جمع کرنا
بڑے ہو کر سائنسدان بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگلش۔
کامورا لائن، کوئٹ روڈ، جیکب آباد شہر ———

سیّد نجم احمد، بارہ سال
جماعت ہفتم، مشغلہ آنکھ مچولی پڑھنا
بڑے ہوکر انجینئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب

۵/۸۷۵ سندھی ہوٹل لیاقت آباد ——— کراچی

عبدالقدیر، سولہ سال
جماعت نہم، مشغلہ ٹکٹ جمع کرنا
بڑے ہوکر درزی بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، ڈرائنگ

جی/۹ الفلاح ہاؤسنگ سوسائٹی، ملیر ہالٹ، ——— کراچی

اعظم علی، پندرہ سال
جماعت دہم، مشغلہ، ہاکی کھیلنا
بڑے ہوکر سول انجینئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، فزکس

۱/۴۹، لیاقت آباد ——— کراچی نمبر ۱۹

سیّد احمد عباس، بارہ سال
جماعت ہفتم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔
پسندیدہ مضمون، سائنس

۷۰۳، کریم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن ——— لاہور

تلانگ، بارہ سال
جماعت ششم، مشغلہ، قلمی دوستی
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، جغرافیہ

گورنمنٹ ہائی اسکول، جیوانی ——— مکران بلوچستان

آصف عبدالرؤف، پندرہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، رسائل پڑھنا
بڑے ہوکر بینک آفیسر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب

آصف منزل، ٹاپ فلور، راگھو اسٹریٹ، رام سوامی ——— کراچی

زاہد حسین، چودہ سال
جماعت ہفتم، مشغلہ، مطالعہ کرنا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگلش

معرفت، عوامی ہیئر ڈریسر، بیراج روڈ ——— سکھر

مظہر علی، سولہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر انجینئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اسلامیات

۱/سی/۲۶۲ اورنگی ٹاؤن، منگھوپیر روڈ ——— کراچی

مقصود الرحمٰن، تیرہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر فوجی بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس

۴۲/بی گلبہار کالونی نمبر ۱ ——— کراچی

سیّد اظہر حسین زیدی، گیارہ سال
جماعت ششم، مشغلہ، تلاوت قرآن
بڑے ہوکر محتاجوں کا سہارا بنوں گا
پسندیدہ مضمون، حساب

ٹنڈو آغا حسین آباد، پھیلی روڈ ——— حیدرآباد

متین، چودہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، ہاکی کھیلنا
بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب
مکان نمبر ۴ ، سکندر ٹاؤن، جی ٹی روڈ، پشاور شہر

راشد پرویز خانزادہ، تیرہ سال
جماعت ششم، مشغلہ، قلمی دوستی کرنا
بڑے ہو کر ڈپٹی کمشنر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگلش
۱۴۸۔ سی ای، خانزادہ محلہ، نیو سکرنڈ، ـــــ ضلع نواب شاہ

محمد اشرف، چودہ سال
جماعت نہم، مشغلہ قلمی دوستی
بڑے ہو کر کرکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس
نیو کمہار واڑہ ، میوہ شاہ روڈ، ـــــ لیاری، کراچی

شاہد احمد، سولہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، ہاکی کھیلنا
بڑے ہو کر گلوکار بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اردو
مکان نمبر ۸۴ وارڈ نمبر ۱۲ محلہ شرقی، ـــ تلہ گنگ

اقرار احمد، پندرہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، جوڈو کراٹے سیکھنا
بڑے ہو کر پائلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، مطالعہ پاکستان
۵۸۹ ، سیکٹر نمبر ۴/ ای اورنگی ٹاؤن ـــــ کراچی

شیر نواز بابر، گیارہ سال
جماعت ششم، مشغلہ، جمپ لگانا
بڑے ہو کر سائنسدان بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس
مکان نمبر ۲۵۲/۳ ای محلہ شیخ سلیم، بنوں شہر سرحد ـــ

○ قلمی دوستی کے اس کالم میں صرف اسکول کے طلبہ وطالبات شریک ہو سکتے ہیں۔
○ کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا۔
○ خراب اور نامکمل کوپن قابل قبول نہ ہوں گے۔
○ طالبات قلمی دوستی کے لئے اپنی تصاویر نہ بھیجیں۔

نام ــــــــــ عمر ــــــ جماعت ــــــــــ
مشاغل ــــــــــ اسکول میں پسندیدہ مضمون ــــــــــ
بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں۔ ــــــ وجہ ــــــ
پتہ ــــــــــــــــــــ

امّی ابّو کا صفحہ

اکثر لوگ مہمانوں کی آمد سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ عام مہمانوں سے نہیں صرف اُن مہمانوں سے جن کے ہمراہ بچّے بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ بچّے گھر میں داخل ہوتے ہی ایک طوفانِ بدتمیزی مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی میز پر چڑھ جاتا ہے کوئی کارنس پر رکھی فریم شُدہ تصویر سے کھیلتے کھیلتے اُسے توڑ دیتا ہے۔ کوئی کتابوں اور رسائل کے ورق پھاڑ کر اس سے جہاز یا کشتی بنانے لگتا ہے اور گھر میں اس نوع کی چیزیں موجود نہ ہوں تو یہ بچّے مار دھاڑ سے بھرپور پروگرام پیش کرتے ہیں۔ جس کا اختتام حلق پھاڑ پھاڑ کر رونے اور چلّانے پر ہوتا ہے۔ ایسے مہمان اور اُن کے بچّے میزبان کے لیے بن بُلائی آفت ہوتے ہیں جس سے جلد از جلد چھٹکارا پانے کی وہ دل ہی دِل میں دُعائیں مانگتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر ان بچّوں کے سرپرست اپنے بچّوں کی اِن شرارتوں کا سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیتے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "پپّو! بھئی شور نہ مچاؤ" "بھئی آرام سے بیٹھو" "کیا کریں ان بچّوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے" تب میزبان کو اخلاقاً کہنا پڑتا ہے "کوئی بات نہیں، بچّے تو شرارت کرتے ہی ہیں" بہت سے والدین کو یہ بھی کہتے سُنا گیا ہے کہ "گھر میں تو یہ بہت تمیز سے رہتا ہے، دوسروں کے ہاں جاتے ہی پتہ نہیں اسے کیا ہو جاتا ہے"

درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ جن بچّوں کو ابتدا ہی سے تمیز و تہذیب سکھائی جاتی ہے وہ گھر اور گھر سے باہر یکساں شائستہ طور طریقوں کے مالک ہوتے ہیں۔ بچّوں کے لیے بے جا لاڈ پیار اور بے جا روک ٹوک دونوں ہی رویّے ان میں ضد، ہٹ دھرمی اور خودسری کی ناپسندیدہ عادتیں پختہ کر دیتے ہیں۔ ماں باپ اپنے گھر کی حد تک تو ان کی من مانی کارروائیاں گوارہ کر سکتے ہیں لیکن ہر ایک کے لیے ان کا برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ خصوصاً ایسے لوگ جو طبعاً صفائی پسند ہوں، امن پسند ہوں، اپنے گھر کو سجا بنا کر رکھتے ہوں، وہ ایسے نٹ کھٹ اور شرارتی بچّوں کے ہاتھوں اپنے گھر کی صفائی ستھرائی اور امن و سکون کو برباد ہوتے دیکھ کر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ والدین کو چاہیئے کہ وہ اپنے بچّوں کے ہمراہ کہیں جانے سے پہلے بچّوں کو خوبصورتی سے ذہن نشین کرا دیں کہ اگر وہ ایک اچھے بچّے کی طرح میزبان کے گھر وقت گزاریں گے تو انھیں اس کے عوض انعام دیا جائے گا، بصورتِ دیگر آئندہ انھیں کہیں نہیں لے جایا جائے گا اور پھر اس وعدے کو پورا بھی کیا جائے، کیونکہ بچّہ انعام ملنے کا وعدہ کبھی نہیں بھولتا۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ ذمّہ داری ماں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ شروع ہی سے بچّے کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھے اور بچّے کی مناسب اصلاح کرتی رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس نوعیت کے مسائل پیدا ہوں۔

اپنے دانتوں کو
مزے سے صاف کیجئے

کرسٹل کے تین ذائقے تینوں مزے دار
کرسٹل ریڈ جیل میں چیری، گرین جیل میں
منٹ اور کرسٹل وہائٹ میں منٹ فریش۔

کرسٹل سے برش کیجئے، ٹوتھ پیسٹ کا مزا
لیجئے دانت ہمیشہ صاف، چمکدار اور کیڑا
لگنے سے محفوظ۔

crystal
سائنس خوشگوار، دانت چمکدار

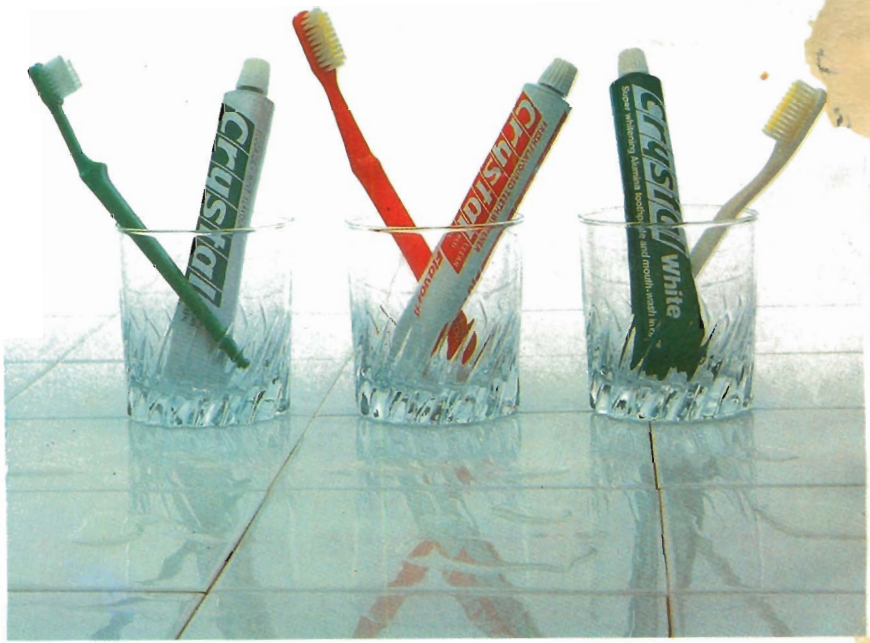

Interflow-APL-100

Regd. No. M-266 NOVEMBER 1987
Monthly AANKH MICHOLEE Karachi